تفقہ فی الدین کا داعی ادارہ

ماہ نامہ

مفاہیم

جلد ۳ / شمارہ ۹

فقہ اکیڈمی کا ترجمان

ستمبر ۲۰۲۳ء بمطابق ربیع الاول ۱۴۴۵ھ

- سرہانے میر کے
- الفاظ کی جادوگری کا فتنہ
- سلطان عبد الحمید کی معزولی کا حقیقی سبب

ليتفقهوا في الدين

زاجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگان محفوظ تر

اقبال

من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين

ماہ نامہ

مفاہیم

کراچی

فقہ اکیڈمی کا ترجمان | تفقہ فی الدین کا داعی ادارہ

سرپرستِ اعلیٰ

حضرت مولانا مفتی نذیر احمد ہاشمی صاحب مدظلہ

مدیر

صوفی جمیل الرحمٰن عباسی

نائب مدیر

مولانا حماد احمد ترک

مجلسِ مشاورت

- ڈاکٹر محمد رشید ارشد
- مفتی اویس پاشا قرنی
- مولانا معراج محمد
- مولانا سید اسامہ علی
- مولانا ابرار حسین
- مولانا عابد علی بھٹی

فقہ اکیڈمی

C-335، بلاک-1، گلستان جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی، پاکستان۔ 3474 3662 21 92 + | 3474 3661 21 92 +

FIQHACADEMY.COM.PK FIQHACADEMY FIQHACADEMYPK +92 330 3474223

قال اللہ عزوجل

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ أُحِلَّتْ لَكُم بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ إِلَّا مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَأَنتُمْ حُرُمٌ إِنَّ اللهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ ﴿المائدة:١﴾

"اے ایمان والو! پورا کرو عہدوں کو۔ حلال ہوئے تمھارے لیے چوپائے مویشی سوائے ان کے جو تم کو آگے سنائے جاویں گے۔[1] مگر حلال نہ جانو شکار کو احرام کی حالت میں۔[2] اللہ حکم کرتا ہے جو چاہے"۔

[1] غالباً اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو اسی رکوع کی تیسری آیت میں بیان کی گئی ہیں۔ یعنی "حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ" سے "ذٰلِكُمْ فِسْقٌ" تک۔

[2] محرِم کو صرف خشکی کے جانور کا شکار جائز نہیں، دریائی شکار کی اجازت ہے۔ اور جب حالتِ احرام کی رعایت اس قدر ہے کہ اس میں شکار کرنا ممنوع ٹھہرا تو خود حرم شریف کی حرمت کا لحاظ اس سے کہیں زیادہ ہونا چاہیے۔ یعنی حرم کے جانور کا شکار محرم و غیر محرم سب کے لیے حرام ہوگا جیسا کہ لَا تُحِلُّوْا شَعَائِرَ اللّٰهِ کے عموم سے مترشح ہوتا ہے۔

قال الرسول ﷺ

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، مَرَّ النَّبِيُّ ﷺ عَلَى رَجُلٍ، وَهُوَ يُعَاتِبُ أَخَاهُ فِي الحَيَاءِ، يَقُولُ: إِنَّكَ لَتَسْتَحْيِي، حَتَّى كَأَنَّهُ يَقُولُ: قَدْ أَضَرَّ بِكَ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «دَعْهُ، فَإِنَّ الحَيَاءَ مِنَ الإِيمَانِ».(بخاري)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ کا گزر ایک ایسے شخص پر ہوا جو اپنے بھائی پر حیا کی وجہ سے ناراض ہو رہا تھا۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا کہ تم بہت شرماتے ہو، یعنی وہ یہ کہہ رہا تھا کہ تم حیا کی وجہ سے اپنا نقصان کر لیتے ہو۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا: "اسے چھوڑ دو بے شک حیا ایمان میں سے ہے"۔

یعنی بہت زیادہ جری ہو جانا اور ہر معاملے میں آگے آگے رہنا، ہر موقعے پر گفتگو میں حصہ لینا یہ کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے۔ شرم و حیا، کم گوئی اور خود نمائی سے اجتناب مطلوبہ اوصاف ہیں۔ ان اوصاف کو اختیار کرنے میں رکاوٹ بننا اور ان سے منع کرنا درست نہیں۔

مضامین

نعت	سلام بحضور خیر الانام ﷺ	سید نفیس الحسینی شاہ رحمہ اللہ	۵
اداریہ	سانحہ جڑانوالہ	مدیر	۷
مقالات	اصحابِ کہف اور چند محققین کی آرا	مولانا محمد اقبال	۱۱
مقالات	الفاظ کی جادوگری کا فتنہ	ڈاکٹر محمد رشید ارشد	۱۵
مقالات	سلطان عبدالحمید کی معزولی کا حقیقی سبب	محمد نعیم ندوی صدیقی	۲۲
مقالات	شوکتِ سنجر و سلیم	مولانا حماد احمد ترک	۳۱
مقالات	بیت المقدس کا تاریخی خاکہ	صوفی جمیل الرحمٰن عباسی	۳۹
مقالات	معاشی آزادی، دولت کی غیر مساویانہ تقسیم اور کرپٹو کرنسی	ڈاکٹر مبشر حسین رحمانی	۴۶
مسئلوں	نماز میں عملِ کثیر کا مطلب	دارالافتاء، فقہ اکیڈمی	۵۰
ادبیات	سرہانے میرؔ کے	احمد جاویدؔ	۵۲
ادبیات	خاطر خواہ یعنی...؟	ڈاکٹر رؤف پاریکھ	۵۵

حضرت سید نفیس الحسینی شاہ نفیس رقم رحمہ اللہ

نعت

سلام بحضورِ خیر الانام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

الٰہی محبوبِ کُل جہاں کو دل و جگر کا سلام پہنچے
نفَس نفَس کا درود پہنچے، نظر نظر کا سلام پہنچے

بِساط عالم کی وسعتوں سے، جہانِ بالا کی رفعتوں سے
مَلَک مَلَک کا درود اترے، بشَر بشَر کا سلام پہنچے

حضور کی شام شام مہکے، حضور کی رات رات جاگے
ملائکہ کے حسیں جِلَو میں، سحر سحر کا سلام پہنچے

زبانِ فطرت ہے اس پہ ناطق، بہ بارگاہِ نبیؐ صادق
شجر شجر کا درود جائے، حجر حجر کا سلام پہنچے

رسولِ رحمت کا بارِ احساں تمام خلقت کے دوش پر ہے
تو ایسے محسن کو بستی بستی، نگر نگر کا سلام پہنچے

مرا قلم بھی ہے ان کا صدقہ، مرے ہنر پر ہے ان کا سایہ
حضورِ خواجہ مرے قلم کا، مرے ہنر کا سلام پہنچے

یہ التجا ہے کہ روزِ محشر گناہ گاروں پہ بھی نظر ہو
شفیعِ امت کو ہم غریبوں کی چشمِ تر کا سلام پہنچے

نفیسؔ کی بس دعا یہی ہے، فقیر کی اب صدا یہی ہی
سوادِ طیبہ میں رہنے والو کو عمر بھر کا سلام پہنچے

*****

ادار یہ

سانحۂ جڑانوالہ

سانحہ جڑانوالہ شرعی اعتبار سے تو قابلِ مذمت ہے ہی لیکن مسلمان اکثریتی علاقے میں عددی و مالی ہر اعتبار سے اقلیت پر تشدد کیا جانا اسلامی و انسانی ہر دو قسم کی شرافت و مروت کے منافی ہے۔ اس بزدلانہ کارروائی پر بیان بازی سے آگے بڑھ کر حقیقی طور پر شرمسار ہونا فطرت کا تقاضا ہے۔ اگر توہینِ قرآن کے واقعے کو سچ تسلیم کر بھی لیا جائے تو بھی قرآن سے محبت اور اس پر ایمان کے کسی دعوے دار کے لیے جائز نہ تھا کہ وہ عیسائیوں کے عبادت خانے پر حملہ آور ہوتا۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ اس کے قرآن پاک میں یہ آیت مبارکہ موجود ہے: ﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللهِ كَثِيرًا﴾ (الحج:۴۰) ”اور اللہ اگر آدمیوں کے ایک طبقے کو دوسرے سے دفع نہ فرماتا تو خانقاہیں، گرجا، کلیسا اور مسجدیں کہ جن میں اللہ کا بکثرت نام لیا جاتا ہے سب ڈھا دیے جاتے“ امام قرطبی نے ابن خُوَیزمَنداد کا یہ قول نقل کیا ہے: تَضَمَّنَتْ هَذِهِ الْآيَةُ الْمَنْعَ مِنْ هَدْمِ كَنَائِسِ أَهْلِ الذِّمَّةِ وَبِيَعِهِمْ وَبُيُوتِ نِيرَانِهِمْ ”یہ آیتِ مبارکہ اہل ذمہ کے گرجا و کلیسا اور آتش کدے ڈھانے کی ممانعت کو بھی لیے ہوئے ہے“۔

کسی بھی عشقِ رسول ﷺ کے دعوے دار کے لیے جائز نہ تھا کہ وہ نصرانی عبادت گاہوں کو ڈھانے کی جسارت کرتا جب کہ رسولِ خدا ﷺ کا یہ فرمان موجود ہے: «أَنْ لَا تُهْدَمَ لَهُمْ بَيْعَةٌ، وَلَا يُخْرَجَ لَهُمْ قَسٌّ، وَلَا يُفْتَنُوا عَنْ دِينِهِمْ». (سنن ابي داوٗد) ”یہ کہ ان کے عبادت خانے نہیں گرائے جائیں گے اور ان کے پادریوں کو نہیں نکالا جائے گا اور نہ ہی انھیں ان کے دین کی طرف سے زبردستی روکا جائے گا“۔ لیکن ان نصوص کی موجودگی کے باوجود ایمان کے دعوے دار نہ صرف یہ کہ ان کے عبادت خانوں کو آگ لگاتے ہیں بلکہ ان کا قیمتی ساز و سامان تک لوٹنے سے نہیں شرماتے۔

مختلف طبقات کی طرف سے اس سانحے کی خوش آئند اور قابلِ تعریف مذمت ہمارے سامنے ہے اور امدادی چیکوں کی تقسیم کی تقریب میں کی گئی نگران وزیر اعظم کی تقریر اور ان کا یہ جملہ ہمارے پیشِ نظر ہے کہ ''سانحہ جڑانوالہ ہمارے معاشرے میں ایک مرض کی نشاندہی کرتا ہے'' بیماری کا نام اگرچہ نہ لیا گیا لیکن مرض کی موجودگی کا اعتراف بھی بڑی بات ہے۔ وزیر اعظم نے عجیب بات یہ فرمائی کہ ''کوئی بھی معاشرہ عدل وانصاف کے اصول کی پابندی کرتے ہوئے قائم رہ سکتا ہے۔ مادی وسائل اور علمی جدوجہد معاشرے کے بقا کی ضمانت نہیں دے سکتے بلکہ عدل وانصاف ہی ہے جو کسی معاشرے کی بقا کا ضامن ہے'' یہ سچ ہے لیکن آدھا۔ اگرچہ مادی وسائل کی بہتری امن و امان کے لیے ضروری ہے لیکن علمی جدوجہد تو ایسی چیز ہے جس کے بغیر عدل وانصاف کا قیام مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہے۔ یہی ہمارا مرض ہے یہی ہماری بیماری ہے جس کا نام لینا تو درکنار آں جناب نے اس کا انکار ہی کر دیا۔

وہی منصفوں کی روایتیں وہی فیصلوں کی عبارتیں
مرا جرم تو کوئی اور تھا پہ مری سزا کوئی اور ہے

نگران وزیر اعظم نے اسلام اور اسلامی تاریخ کی روشنی میں حالیہ واقعے پر ''دھندلی سی روشنی'' ڈالتے ہوئے کہا: ''ابتدائی اسلامی تاریخ میں جب مسلم کمیونٹی نسبتاً بے مال و متاع اور بے آسرا تھی، ان کو جو پہلی مدد و نصرت حاصل ہوئی ہے وہ نجاشی عیسائی بادشاہ کی طرف سے ہوئی ہے اور آپ ﷺ نے ان کی غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کی''۔ بلاشبہہ نجاشی نے عیسائیت پر رہتے ہوئے مسلمانوں کی مدد کی لیکن یہ بھی یقینی بات ہے کہ ان کی نمازِ جنازہ قبولِ اسلام کے بعد پڑھی گئی۔ اب وزیر اعظم اس موٹی بات سے بے خبر ہیں تو مصیبت ہے اور اگر جان بوجھ کر اسلام کا ذکر گول کیا تو یہ ایک بڑی مصیبت ہے۔ انھوں نے کہا کہ ''امتِ محمدی پر نماز اور زکاۃ کی طرح فرض ہے کہ وہ اقلیتوں کی حفاظت کرے''۔ سوال یہ ہے کہ امت محمدی کے راہنما اور امیر ہونے کے ناتے خود وزیر اعظم پر کیا فرض ہے۔ کیا اسلام کا نفاذ ان کی ذمے داری نہیں ہے۔ کیا انھوں نے معلوم نہیں کیا کہ جو احادیث اہلِ کتاب ذِمیوں کے حقوق بیان کرتی ہیں ان میں یہ بھی مذکور ہے کہ انھیں سود خوری ہر حال میں ترک کرنا ہوگی ورنہ ان کی سرپرستی جاری نہیں رکھی جا سکے گی (البتہ ان پر ظلم و زیادتی پھر بھی جائز نہ ہوگی)۔ حدیث شریف کے الفاظ ہیں: «مَا لَمْ

يُحْدِثُوا حَدَثًا، أَوْ يَأْكُلُوا الرِّبَا»۔ ”جب تک وہ معاہدوں کی خلاف ورزی نہ کریں یا سود نہ کھائیں“ عیسائیوں کو تور ہنے دیں، ستم ظریفی دیکھیے کہ ملکِ عزیز میں مسلمان سود خوری کر رہے ہیں، بینکاری اور مہاجنی دونوں قسم کے سود عروج پر ہیں اور نجی ادارے موبائل ایپلی کیشنز کے ذریعے سودی قرضے دیے جا رہی ہیں اور ان کے شکنجے میں پھنس کر مسلمان عوام خودکشی پر مجبور ہوتے جا رہے ہیں۔ تو اس سود خوری کو ختم کرنا، کیا وزیرِ اعظم پر نماز اور روزے کی طرح فرض نہیں ہے۔ یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ یہاں سود کو ہم نے بطورِ مثال ذکر کیا ہے، ہماری مراد اس سے اسلامی قوانین اور ضابطوں کا نفاذ ہے۔ یہی وہ بیماری ہے جس کی وجہ سے ہم گوناگوں مسائل کا شکار ہیں۔ وہ صبر و تحمل و برداشت جس کی کمی کا رونا سارے رو رہے ہیں اور جس کے فقدان نے ہمیں یہ دن دکھائے کیا اسلامی تعلیم و تربیت کے بغیر ممکن ہے؟ اور اگر ممکن نہیں تو اس اسلامی تعلیم و تربیت کی ذمے داری کیا ریاست پر عائد ہوتی ہے یا نہیں۔ اصل میں اسلام ایک وحدت ہے، آپ یہ کہیں کہ معاشرے میں رواداری اور تحمل اسلام سے لے لیں اور سود خوری اور رقص و سرود اور دیگر غیر اسلامی طرزہائے عمل کو جاری رہنے دیں تو یہ نہیں ہو سکتا۔ جب آپ اعمال سے اسلام کو نکالیں گے یا نکلنے دیں گے تو اخلاق اور رویوں سے یہ از خود نکلتا جائے گا۔

عدم برداشت کا غیر اسلامی رویہ سیاست و مذہب دونوں میں موجود ہے۔ ایک معصوم اور کمسن بچی پر ایک جج کا تشدد، ایک کم سن ملازمہ پر ایک جعلی پیر کا تشدد، نور مقدم کیس میں ایک لبرل کا تشدد، باچا خان یونی ورسٹی میں مشعال خان کا قتل اور پھر ۹ مئی کے واقعات، یہ چند مثالیں ہمارے معاشرے کی مجموعی شکست و ریخت کی عکاسی کرتی ہیں۔ تو ایک بڑی تعمیری تحریک کی ضرورت ہے جس کی ابتدا علمی جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں جس کی نفی وزیرِ اعظم کر رہے ہیں۔ بلکہ ہم اس میں اضافہ کریں گے کہ ٹھوس اسلامی علمی جدوجہد کی ضرورت ہے کہ جس کا نام لیتے ہوئے ہم شرماتے ہیں۔

توجناب! آپ صاحبِ اقتدار ہیں۔ آپ تو برائی کو ہاتھ سے روکنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ آپ وعظ نہ فرمائیں بلکہ عمل کی دنیا میں آگے بڑھیں۔ پنجاب کابینہ کو جڑانوالہ کا دورہ کرنے کی ضرورت نہ پیش آتی اگر حکومتی مشینری بروقت حرکت میں آکر مساجد کے لاؤڈ اسپیکرز سے مسلمانوں کو اکسانے اور ورغلانے والے لوگوں کو حراست میں لے لیتی اور قریبی اضلاع سے مزید فورس بلا کر بلوائیوں کو قابو کر لیتی۔ جب ایسا نہیں ہوا بلکہ پولیس، انٹیلی جنس

ادارے اور جڑانوالہ کے عیسائی اسسٹنٹ کمشنر تک خواب غفلت میں ڈوبے رہے تو اس کوتاہی کے مرتکب حضرات کو کیا انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے گا کہ تقریریں ہی کی جاتی رہیں گی۔ جن دو عیسائیوں پر توہینِ قرآن کا الزام تھا ان کے نام کی ایف آئی آر کاٹنے پر اکتفا نہ کیا جاتا بلکہ انھیں فی الفور گرفتار کر کے قانون کے مطابق اگلے چوبیس گھنٹوں کے اندر ان کا چالان عدالت میں پیش کیا جاتا اور جج صاحبان شفاف تحقیق کر کے یا تو انھیں عدالتی و حکومتی تحفظ کے سائے میں باعزت بری کرتے یا جرم ثابت ہونے پر جرم کے بقدر انھیں سزا سناتے تو بات تھی اور اب بلوائیوں کو گرفتار کیا ہے تو ان کا شفاف ٹرائل کر کے انھیں قرار واقعی سزا دی جائے تو نہ صرف آئندہ یہ واقعات کم ہو سکتے ہیں بلکہ عدل و انصاف کی عالمی رینکنگ میں پاکستان ایک سو تیسویں نمبر سے کچھ اوپر آ سکتا ہے۔ صاحبو! کام کرنے کی ضرورت ہے اور ٹھوس کام کرنے کی ضرورت ہے علمی بھی اور عملی بھی:

یہ گھڑی محشر کی ہے، تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

*****

مولانا محمد اقبال

اصحابِ کہف اور چند محققین کی آرا

قرآنِ کریم بلا شبہہ پیغام رشد وہدایت، آئینِ فلاح وسعادت اور سابقہ تمام آسمانی کتابوں اور الہامی علوم و معارف کا جامع ہے۔ یہ وہ سرچشمۂ ہدایت ہے کہ اس کی تعلیمات کی اثر انگیزی، اس کے کلام کی رعنائی، اس کے معانی و مفاہیم کی وسعت اور اس کے فیوض و برکات کا سلسلہ چودہ سو سال سے قائم ہے اور تاقیامِ قیامت جاری رہے گا۔ قرآنِ کریم چونکہ اصلاً ہدایت کی کتاب ہے اس لیے اس کا انداز عموماً وعظ و نصیحت اور فکرِ آخرت پر مشتمل ہوتا ہے، مگر اس کے بیچ میں کچھ نہ کچھ احکام اور واقعات کا بھی ذکر ہوتا رہتا ہے۔ یہ واقعات اگرچہ اجمالی نوعیت کے ہوتے ہیں، مگر ان میں انسانیت کے لیے سامانِ ہدایت و رہنمائی ہے۔ ان واقعات میں سے ایک واقعہ اصحابِ کہف کا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربانی دینے والوں کے لیے ایک سبق ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحابَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيمِ كانُوا مِنْ آياتِنا عَجَباً﴾ "کیا تمھارا یہ خیال ہے کہ غار اور رقیم والے لوگ ہماری نشانیوں میں سے کچھ (زیادہ) عجیب چیز تھے؟" اس میں اصحابِ کہف یعنی "غار والوں" کا ذکر کیا گیا۔ قرآنِ کریم نے اس واقعے کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں ایک بت پرست بادشاہ کی حکومت تھی اور اس کے زیرِ اثر اس کی رعایا بھی شرک میں مبتلا ہو گئی تھی۔ جبکہ اسی زمانے میں کچھ صالح نوجوانوں نے توحید کا علم بلند کیا ہوا تھا۔ چنانچہ بادشاہ اور شہر کے لوگوں کی نظر میں ان نوجوانوں کا توحید پر ایمان رکھنا جرم بن گیا۔ لہذا بادشاہ نے ان کو اس "مبینہ جرم" کی پاداش میں ستانا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں چونکہ خوب ایمانی ترقی عطا فرمائی تھی، اس لیے وہ ہر قسم کے ظلم و جبر کے باوجود توحید پر کاربند رہے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ قوم کے مظالم کی وجہ سے ان کے لیے اپنے ایمان کی حفاظت مشکل محسوس ہونے لگی، تو ان حضرات نے اپنی قوم سے علیحدگی اختیار کر

لی۔ اور آپس میں مشاورت کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ جب ہم نے دینِ حق اختیار کر لیا ہے اور اپنے شہر میں دین پر قائم رہنا انتہائی مشکل ہو رہا ہے، تو ہمیں شہر چھوڑ دینا چاہیے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ضرور ہمارے لیے کوئی راستہ نکالے گا۔ لہٰذا وہ اپنے ایمان وعقیدے کی حفاظت کے واسطے شہر سے نکل کر ایک غار میں چھپ گئے۔ ان کے ساتھ ایک کتا بھی تھا جو غار کے دہانے پر بیٹھ رہا۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر گہری نیند مسلط کر دی اور وہ تین سو سال یا مزید نو سال تک اسی غار میں پڑے سوتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے انھیں تین صدیوں تک زندہ رکھا اور ان کے جسم بھی سلامت رہے۔ پھر جب ان کی آنکھ کھلی تو انھیں صحیح اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی مدت سوتے رہے ہیں، لہٰذا وہ اس معاملے میں باہم مکالمہ کرنے لگے۔ جب انھیں بھوک لگی تو انھوں نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک کو کچھ سکے دے کر کھانا خرید کر لانے کے لیے شہر بھیجا اور ساتھ یہ ہدایت بھی کی کہ احتیاط سے جائیں تاکہ بادشاہ اور اس کے کارندوں کو ہمارا پتا نہ چلے۔ مگر وقت بدل چکا تھا اور اُس بت پرست بادشاہ کو مرے ہوئے عرصہ گزر چکا تھا اور اب ایک صاحبِ ایمان بادشاہ تخت نشین تھا۔ بہر حال یہ جب کھانا لینے شہر میں پہنچے اور بطورِ قیمت وہی پرانی کرنسی پیش کی، جس کا چلن عرصہ ہوئے ختم ہو چکا تھا اور شہر میں نئی کرنسی رائج ہو چکی تھی۔ جس دکان دار سے وہ خریداری کر رہے تھے اس نے پرانے سکے پر تعجب کا اظہار کیا اور یوں پورے واقعے کی حقیقت کھل گئی۔ چنانچہ معاملہ موَحِد بادشاہ کی خدمت میں پیش ہوا، انھوں نے اصحابِ کہف کو بڑی عزت اور احترام سے نوازا۔ پھر اصحابِ کہف کی دنیا سے رحلت کے بعد ان کی یادگار کے طور پر ایک مسجد تعمیر کی گئی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک کرشمہ ظاہر ہوا۔ یہاں تک اتنا ہی واقعہ قرآنِ کریم میں مذکور ہے جبکہ آگے تاریخی روایات کی روشنی میں اس واقعے کی تفصیل کا جائزہ لیا جائے گا۔

اصحابِ کہف کا زمانہ اور وطن

اصحابِ کہف کے زمانے اور مقام کے متعلق مسلمان اور مسیحی مؤرخین نے جو تفصیلات بیان کی ہیں ان میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ بعض محققین کا خیال ہے کہ اصحابِ کہف کا غار اندلس میں ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ ابنِ عطیہ رحمہما اللہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ اندلس میں غرناطہ کی طرف ایک گاؤں ہے، جس کا نام ”لوشہ“ ہے، اس میں ایک غار ہے جس میں مردہ لاشیں ہیں، ان کے ساتھ مردہ کتے کا ایک ڈھانچہ بھی ہے۔ ان میں سے اکثر پر تو

گوشت باقی نہیں رہا البتہ بعض پر اب بھی گوشت باقی ہے۔ ایک لمبا عرصہ گزرنے کی وجہ سے ان کے حالات کا صحیح علم نہیں ہے، مگر لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ مردہ لاشیں اصحابِ کہف کی ہیں۔ (تفسیر قرطبی، ج:۱۰، ص:۳۵۸) حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ "رقیم" فلسطین کے نیچے عسفان اور ایلہ (خلیج عقبہ) کے بیچ میں ہے جو نسبتاً ایلہ کے قریب ہے۔ (جامع البيان في تأويل القرآن، ج:۱۷، ص:۶۰۲) شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ فرماتے ہیں کہ یہ اردن کا علاقہ ہے۔ اس بنا پر بعض محققین کا کہنا ہے کہ یہ واقعہ اردن کے شہر عمان کے قریب پیش آیا تھا، جہاں ایک غار میں کچھ لاشیں اب تک موجود ہیں۔ حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی رحمہ اللہ نے قصص القرآن میں، حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے ارض القرآن میں اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے معارف القرآن میں تاریخی و جغرافیائی شواہد کی بنیاد پر اسی طرف اپنا رجحان ظاہر کیا ہے کہ یہ واقعہ اردن میں پیش آیا تھا۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے تھی۔ ان تمام حضرات کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ اردن کے مشہور شہر پٹرا جس کا اصل نام رقیم تھا اور رومی حکومت نے بدل کر اسے پٹرا کر دیا، اصحابِ کہف کا غار اس کے قریب کہیں واقع تھا۔ چنانچہ حضرت شیخ الاسلام صاحب دامت برکاتہم العالیہ فرماتے ہیں: "اتنے پرانے واقعے کے محلِ وقوع کے بارے میں حتمی طور پر سو فیصد یقین کے ساتھ کچھ کہنا تو مشکل ہے، لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ اب تک جتنے مقامات کے بارے میں مقام اصحابِ کہف ہونے کی رائے ظاہر کی گئی ہے، ان سب میں جتنے زیادہ قرائن و شواہد اس غار کے حق میں ہیں، کسی اور غار کے حق میں اتنے قرائن موجود نہیں ہیں"۔ (جہانِ دیدہ، ص:۲۱۸ تا ۲۲۲) جبکہ مسیحی مؤرخ اور کاہن یعقوب (یا جمیس) نے ۵۲۱ھ میں اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد سن ۲۵۰ء میں ایشائے کوچک کے شہر افسس میں پیش آیا ہے اور ان نوجوانوں کی تعداد سات تھی۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، بحوالۂ جہانِ دیدہ، ص:۲۱۷) چنانچہ عیسائی مؤرخین کے ہاں یہ واقعہ Seven Sleepers یعنی سات سونے والوں کے نام سے مشہور ہے۔ اسی طرح مشہور مؤرخ ایڈورڈ گبن نے "زوال و سقوطِ سلطنتِ روم" میں لکھا ہے کہ یہ واقعہ ترکی کے شہر افسس میں بادشاہ ڈوسیس کے زمانے میں پیش آیا تھا۔ اس کے مظالم سے تنگ آکر یہ نوجوان غار میں چھپ گئے تھے، پھر جس بادشاہ کے زمانے میں یہ حضرات بیدار ہوئے، وہ تھیوڈوسیس تھا۔ (توضیح القرآن) جبکہ بعض مفسرین نے اس ظالم بادشاہ کا نام دقیانوس ذکر کیا ہے، جس کے

دور میں اصحابِ کہف اس کے ظلم وستم سے تنگ آکر غار میں چھپ گئے تھے۔ بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ جس بت پرست بادشاہ کے عہد میں یہ واقعہ پیش آیا تھا، اس کا نام ٹراجان تھا جو سن ۹۸ء تا ۱۱۷ء حکمران رہا۔ یہ بڑا ظالم بادشاہ تھا، بت پرستی سے انکار کرنے والوں پر اس کے مظالم مشہور ہیں۔ اس نے اصحابِ کہف پر ظلم کی حد کر دی تھا۔ اس کے ظلم وستم سے تنگ آکر اصحاب کہف غار میں چھپ گئے تھے۔ تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ اس بادشاہ نے ۱۰۶ء کو شرقِ اردن کا علاقہ فتح کر لیا تھا۔ (جہانِ دیدہ، ص:۲۲۰) ان کے عہد کے متعلق امام ابن کثیر رحمہ اللہ کا رجحان یہ ہے کہ اصحاب کہف کا واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے پہلے کا ہے۔ اس پر انھوں نے یہ قرینہ بیان فرمایا ہے کہ مشرکینِ قریش کو یہودی علما نے یہ سوال سکھایا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کی کتابوں میں یہ واقعہ مذکور تھا، اگر یہ واقعہ ملتِ عیسوی میں پیش آتا تو یہودی اسے بیان نہ کرتے۔ (تفسیر ابنِ کثیر، ج:۴، ص:۱۴۰) بہرحال یہ سب تاریخی آرا ہیں، ان میں کوئی حتمی رائے قائم کرنا ممکن نہیں ہے، یہاں جتنی باتیں ہیں، ان کی حیثیت محض ایک تخمین کی سی ہے۔

سورۃ الکہف کے مضامین کو موضوع بنانے والے محققین میں حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ کا نام بہت معروف ہے۔ انھوں نے پوری سورت کی تفسیر الگ سے لکھی مگر اصحابِ کہف کے واقعے کی تفصیلات بس اتنی ہی بیان فرمائیں جتنی قرآنِ کریم میں مذکور ہیں۔ اس کی وجہ وہ یہی بتاتے ہیں کہ قرآن کا مقصد تذکیر و نصیحت ہے، یہ کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے، اس لیے قرآنِ کریم نے بھی اس واقعے کی اتنی تفصیل بیان کی گئی ہے جو مقصد میں معاون ہے۔ اصحابِ کہف کے واقعے کی کرید سے خصوصی طور پر منع فرمایا گیا ہے، مولانا گیلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”یہی واقعہ جو کسی زمانے میں پیش آیا تھا، جیسا کہ قرآن کا دستور ہے اپنے مقصد کی حد تک اس سرگزشت کے خاص اجزا اور عناصر کا انتخاب کر کے صراحتاً اس کی ممانعت بھی کر دی گئی تھی۔ قرآن ہی میں اس کی ممانعت کر دی گئی تھی کہ جو کچھ سنا دیا گیا اس سے زیادہ خواہ مخواہ قصے کی دوسری تفصیلات کی جستجو اور تلاش میں مسلمانوں کو مبتلا نہ ہونا چاہیے۔ ﴿وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِمْ مِنْهُمْ أَحَدًا﴾ ”اور نہ پوچھنا اس (یعنی اصحاب) کے متعلق ان سے (جو جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں) کسی سے بھی“۔ جس کا حاصل یہی ہوا کہ قصے کے متعلق جتنی باتوں کا صراحتاً قرآن نے ذکر کیا ہے جس غرض کے لیے قصہ نقل کیا ہے اس کے لیے وہی باتیں کافی ہیں“۔ (دجالی فتنے کے نمایاں خدوخال، ص:۱۰۵)

*****

ڈاکٹر محمد رشید ارشد

الفاظ کی جادوگری کا فتنہ

قسط نمبر ۱

غالباً ضیاء الحق صاحب کا دور تھا۔ اس دور میں ایک سیاسی اتحاد ہوتا تھا جو قومی اتحاد کہلاتا تھا، اس اتحاد میں شامل جماعتیں حکومت میں بھی شامل تھیں۔ ان جماعتوں میں سے ایک، جماعتِ اسلامی بھی تھی جو کچھ عرصے حکومت میں رہی۔ جماعتِ اسلامی کی طرف سے محمود اعظم فاروقی صاحب وزیرِ اطلاعات تھے۔ سلیم احمد صاحب ان کے مشیر رہے۔ محمود اعظم فاروقی صاحب کا ایک مضمون کچھ عرصے پہلے پڑھا، جس کا عنوان تھا: ''قوم اور دانشور''۔ اس کا آغاز انھوں نے ایک بہت اچھے جملے سے کیا تھا کہ: ''موجودہ زمانہ فتنۂ الفاظ کا زمانہ ہے''۔ اور یہ اسّی کی دہائی کی ابتدا کی بات ہو رہی ہے۔ اب تقریباً اس بات کو چالیس سال ہونے کو آرہے ہیں۔ اور جب انھوں نے یہ بات کہی تھی اس وقت تو شاید یہ فتنہ اتنا زیادہ ظاہر نہیں ہوا تھا، لیکن اب جس دور میں ہم رہتے ہیں اس میں تو یہ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ پہلے عام لوگوں کی گفتگو، ان کا کلام، ان کا مکالمہ نج میں ہوتا تھا، یعنی اپنے دوستوں اور رشتے داروں میں یا اپنے حلقے میں شامل چند لوگوں تک ان کی بات پہنچتی تھی۔ جبکہ عام لوگوں کے برعکس ایک ایسا طبقہ جس کی آواز عوام میں سنی جاتی تھی، وہ دانش ور لوگ ہوتے تھے، ان میں اساتذہ بھی شامل تھے۔ یہ ایک خاص طبقہ تھا جو گفتگو اور کلام کرتا تھا اور لوگوں سے مخاطب ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ الفاظ کا فتنہ ان دانش وروں اور اساتذہ کے کلام تک محدود تھا، کیونکہ ان کے پاس اپنی بات پہنچانے کے لیے نسبتاً ایک وسیع پیمانے پر سامعین ہوتے تھے۔ اور اسی طرح سیاست دانوں کے پاس بھی یہ موقع ہوتا تھا۔ اس زمانے میں بھی ان کی باتیں میڈیا، اخبارات اور میگزین کے ذریعے پہنچتی تھیں۔ اسی طرح شاعر اور ادیب تھے، وہ بھی بہر حال قوم سے گفتگو کرتے تھے۔ جیسے اقبال نے بھی کہا ہے کہ شاعر قوم کا دیدۂ بینا ہوتا ہے۔ عام لوگوں میں چونکہ شعور کی سطح اتنی بلند نہیں ہوتی، وہ اپنے روزمرہ کے

معمولات سے اٹھ کر سوچنے پر کم ہی آمادہ ہوتے ہیں۔ جبکہ دانش ور، سیاست دان، ادیب اور استاذ یہ وہ لوگ ہیں جن کا شعور بلند ہوتا ہے، لفظ سے ان کا تعلق گہرا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے وہ نفسیات، زبان اور تہذیب کا نسبتاً گہرا علم رکھتے ہیں اور وہ لوگوں سے کلام بھی کرتے ہیں۔ اسی طرح صحافی لوگ ہوتے تھے، ان کے پاس بھی کالم لکھنے اور خبریں بنانے کا موقع ہوتا تھا۔ لیکن آج جس دور میں ہم ہیں اس میں تو یہ فتنہ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے، یعنی پہلے دانش وروں کا ایک محدود سا طبقہ ہوتا تھا، لیکن اب جیسے بڑے پیمانے پر دانش وری کی ایک وبا پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہر آدمی کے پاس اپنی آواز پہنچانے، اپنی بات کہنے کا ایک میڈیم موجود ہے اور اس پر کوئی زیادہ خرچ بھی نہیں اٹھتا۔ سوشل میڈیا، فیس بک، انسٹاگرام، ٹیوٹر، واٹس ایپ کے اندر مختلف فورمز ہیں اور وہاں لوگ اپنی بات کرتے ہیں اور مختلف رائے دیتے رہتے ہیں۔ لہٰذا اب یہ معاملہ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ محمود اعظم فاروقی صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ ہم ایک ایسے بازار میں کھڑے ہیں جس میں بے شمار سودے والے چیخ چیخ کر اپنا سودا بیچ رہے ہیں۔ ہر بیچنے والے کا اپنا ایک مخصوص نعرہ ہے، اور ہر نعرہ لگانے والا بس یہ چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کے مال پر ٹوٹ پڑیں۔ اس وقت بھی آپ دیکھ لیں کہ اگر کوئی ٹویٹ کرتا ہے، فیس بک وغیرہ پر کوئی شعر لکھتا ہے تو پھر بار بار اس کو دیکھتا ہے کہ میرا ٹویٹ کتنا ری ٹویٹ ہوا۔ فیس بک پوسٹ کو کتنے لوگوں نے شیئر کیا یا کوئی وڈیو اپلوڈ کی ہے تو کتنے لوگوں نے اس کو دیکھا ہے۔ اسی طرح پچھلے لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا تھا جو رسالوں میں اور میگزین میں لکھتے تھے کہ کتنے لوگ رسالہ پڑھتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر رسالہ پڑھے بھی تو میرا مضمون کتنے لوگوں نے پڑھا؟ لیکن اب بہت سے ویب میگزینز ہیں جن میں لوگوں کو پتا لگ جاتا ہے کہ کتنے لوگوں نے اس کو پڑھا ہے یا اس کو دیکھا ہے اور کتنے لوگوں نے اسے شیئر کیا ہے۔ سلیم احمد صاحب کہا کرتے تھے کہ لوگ ادھر ادھر بھاگتے رہتے ہیں، کبھی اِس سودے کے پیچھے کبھی اُس سودے کے پیچھے اور آخر میں ان کی جیب بھی خالی ہوتی ہے اور ان کے ذہن بھی خالی ہوتے ہیں، یعنی ان کے پلّے کچھ ہوتا ہی نہیں۔

اس صورتِ حال میں صحیح رائے کیسے قائم کی جائے، اور یہ جو ہمارے سامنے الفاظ کی ایک بازی گری ہو رہی ہے، اس کو ہم کیسے دیکھیں اور اس کے بارے میں ہمیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ اس کو ایک خاص پہلو کے تناظر میں دیکھنا چاہیے: زیادہ تر چیزیں پہلے مغرب میں سامنے آتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ ہمارے یہاں بھی سرایت کر جاتی

ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس وقت جو کیپٹل ازم ہے، اس کی پیدائش یورپ میں ہوئی تھی، لیکن سو سال کے لگ بھگ ہو گئے کہ اب موجودہ تہذیب کا قائد امریکہ ہے۔ اور ہمارا پڑوسی ملک بھارت کیپٹل ازم کے خیالات کو قبول کرنے میں بہت جلدی کرتا ہے۔ تو ہمارے ہاں ایک اور میڈیم سے گزر کر یہ چیزیں آتی ہیں، یعنی پہلے امریکہ میں آئیں گی پھر وہاں سے بھارت میں آئیں گی اور پھر پاکستان آئیں گی۔ ایک اور چیز جو ہمارے ہاں وبا کی طرح پھیل رہی ہے، اور اس میں بھی کچھ لوگوں نے مذہبی پہلو کو شامل کر دیا ہے، اس کو موٹیویشنل اسپیکنگ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح Success کے حوالے سے بہت سا لٹریچر چھپتا ہے۔ آج سے کوئی پچیس تیس سال پہلے اس نوعیت کا لٹریچر آتا تھا تو اس وقت ڈیل کارنیگی ان موضوعات پر بہت مشہور آدمی تھا۔ اس کی کتابیں ترجمہ بھی ہوتی تھیں اور عام بھی ہوتی تھیں۔ ایڈورڈ ڈی بونو ایک مشہور آدمی تھا اس کی کتابیں کسی زمانے میں مشہور تھیں۔ اس کے بعد ایک طبقے نے خاص طور سے کاروبار اور مارکیٹنگ کے حوالے سے یا خرید و فروخت کے حوالے سے موٹیویشنل اسپیکنگ شروع کی۔ اس کے بعد یہ کام وسیع پیمانے پر شروع ہو گیا اور اس میں عمومی طور پر ہر انسان کو مخاطب کیا گیا۔ ہر انسان کو کچھ گُر بتائے گئے کہ اگر وہ یہ گر اختیار کر لے تو کامیابی اس کے قدم چومے گی۔ اس میں Stephen Richards Covey سے گویا ایک نیا آغاز ہوا اور The Seven Habits of Highly Effective People نے بہت شہرت حاصل کی۔ پھر ہمارے ہاں بھی اس طرح کے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اس طرح کی کتابیں لکھیں اور یہ کتابیں بہت فروخت ہوئیں۔ اگلا مرحلہ یہ آیا کہ ان موضوعات پر گفتگو شروع ہو گئی اور بڑی بڑی مجالس کا انعقاد ہونے لگا۔ پھر جو کارپوریٹ کلچر ہے اس نے بھی اسے اپنانا شروع کر دیا، بڑی بڑی کمپنیاں موٹیویشنل اسپیکرز کو بلانے لگیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ واٹس ایپ پر چھوٹے چھوٹے کلپ آتے رہتے ہیں، ایسے لوگ بھارت میں بہت سے ہیں جو ان باتوں کو بکثرت موضوع بنا کر فوری شہرت حاصل کر رہے ہیں۔ صاف لگتا ہے کہ جیسے ایک بازی گری ہو رہی ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں اس میں مذہب اور روحانیت کا تڑکا بھی لوگوں نے بہت لگایا ہے۔ مولانا روم کو اور بلھے شاہ وغیرہ کو اس میں ڈال دیا اور دین و دنیا کا "حسین امتزاج" پیدا کر دیا۔ اور اس سے آگے بڑھ کر بہت سے ایسے لوگ جن کی شناخت دینی ہے، انھوں نے بھی اس اسلوب کو اختیار کر لیا۔ یعنی اب کچھ ایسے جدید ادارے بن گئے ہیں کہ جہاں اگر آپ اس آدمی کو کلام کرتے ہوئے دیکھیں تو آپ کو لگے گا کہ اس میں خاص طرح کی

آواز ہوتی ہے، آدمی لاوڈ ہوتا ہے، بہت ایکٹیو ہوتا ہے، اس کی باڈی لینگویج بہت زیادہ ہوتی ہے اور اس میں بہت کوشش کی جاتی ہے کہ عام فہم انداز اختیار کیا جائے اور جیسے بہت نیچے اتر کر گفتگو کی جائے، گفتگو میں ثقالت نہ ہو، گہرائی نہ ہو، اس کے اندر کوئی ایسی چیز نہ ہو جو مجمع سمجھ نہ سکے۔ ہم کسی کی نیت پر گفتگو نہیں کرتے اور نہ ہمیں اس کا حق ہے اور یہ بھی ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کا بالکل فائدہ نہیں ہوتا، یقیناً کچھ لوگوں کو اس سے کچھ نہ کچھ فائدہ ہوتا ہوگا، لیکن اس کا زیادہ تر جو اثر ہے وہ غیر حقیقی اور ناپائیدار ہے، pseudo effect ہے۔ وہاں جو لوگ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں ان کو مثالیں دی جا رہی ہوتی ہیں، ان کے سامنے کامیاب لوگوں کی کہانیاں بیان کی جا رہی ہوتی ہیں اور وہ اس کو بہت تعجب خیز محسوس کرتے ہیں کہ گویا ہم بھی یہ کر سکتے ہیں۔ لیکن ہوتا کچھ بھی نہیں ہے، بس یہاں مختلف چیزیں جوڑ کر آپ کے سامنے ایک تقابل کیا جاتا ہے۔ ایک لحاظ سے آپ دیکھیں تو یہ سب کچھ پرانے طرز کے کسی دیہاتی وعظ سے مشابہ نظر آتا ہے۔ جو انٹرٹینمنٹ جیسی کوئی چیز ہوتی ہے۔ مختلف چیزیں لوگوں کے سامنے آتی ہیں، کبھی لوگ رونے لگتے ہیں کبھی مسکرانے لگتے ہیں۔ لیکن جب وہ مجلس چھوڑ کر جاتے ہیں تو ان کے پلے کچھ ہوتا نہیں ہے، بس وہ وہاں پر ایک اچھا وقت گزار لیتے ہیں۔ یہی حال موٹیویشنل اسپیکرز کا ہے۔

موٹیویشنل اسپیکنگ کا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اس میں جس چیز کی رٹ لگائی جاتی ہے اور بار بار اسے نمایاں کیا جاتا ہے وہ ہے success۔ یعنی ایسے لگتا ہے کہ گویا کامیابی پوجے جانے والی کوئی چیز ہے، اور اصل میں یہ تصور کیپیٹل ازم سے آیا ہے۔ امریکا میں اس کا بہت غلغلہ ہے۔ لینڈ آف ڈریمز اور کامیاب انسان کے اس تصور پر اہلِ مغرب بھی امریکہ کو حقارت سے دیکھتے ہیں۔ انھوں نے کامیابی کو جیسے ایک بُت بنا دیا ہے۔ تو پہلا مسئلہ اس پورے لٹریچر کا یہی ہے کہ اس میں کامیابی اور اس کے تصور کو بیچا جاتا ہے۔ اگر کبھی آپ ان لوگوں کی گفتگو سنیں تو سب سے بڑھ کر وہ حضرت اپنی ہی مثالیں دے رہے ہوتے ہیں۔ میں کیسے ایک موٹر سائیکل سے ایک بی ایم ڈبلیو تک آگیا اور میرا جیسا آدمی بھی یہ مقام حاصل کر سکتا ہے۔ پھر ایک کہانی سنائی جائے گی، اس میں فکشن بہت زیادہ ہوگا، یعنی اس میں حقیقت نہیں ہوگی، مگر آپ کی آنکھوں میں آنسو آجائیں گے۔ اصل مسئلہ کیا ہے کہ کامیابی بہت سی چیزوں میں ہو سکتی ہے لیکن انھوں نے کامیابی کے تصور کو سکیڑ دیا اور اس کو دولت اور شہرت تک محدود کر دیا۔ اور بنیادی طور یہ دو Variables بتائے ہیں کہ کامیابی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی دولت اور شہرت حاصل

کرے۔ اور یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ یہ انسان کا ہمیشہ سے مسئلہ رہا ہے۔ آپ روایتی صوفیانہ لٹریچر کا مطالعہ کریں، جب تفصیل بیان کی جاتی ہے کہ حبِ دنیا سے کیا مراد ہے تو یہی کہا جاتا ہے کہ حبِ دنیا سے مراد ہے حبِ مال اور حبِ جاہ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کیونکہ یہ انسان کے اندر دو چیزیں ایسی رکھی گئی ہیں کہ انسان اس کا حریص ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: ''دو بھوکے بھیڑیے اگر بکریوں کے کسی ریوڑ میں چھوڑ دیے جائیں تو وہ بھی اتنا فساد برپا نہ کریں جتنا مال اور جاہ کی حرص آدمی کے دین کو خراب کرتی ہے''۔ (ترمذی:۲۳۷۶)

دوسری بات یہ ہے کہ اس میں انسانوں کا جو تنوع ہے اس کو بھی سامنے نہیں رکھا جاتا، یعنی جن معنوں میں وہ کامیابی کہہ رہے ہیں وہ کامیابی ہمیشہ انسانوں کی اقلیت کو حاصل ہوتی ہے اکثریت کو حاصل نہیں ہوتی۔ اگر وہ سارا مجمع آپ کے کہنے پر کوشش بھی کر لے تو پچاس لوگوں میں مشکل سے پانچ لوگ وہ حاصل کر پائیں گے۔ یعنی یہ The divine scheme of things کے خلاف ہے، یہ ہوتا بھی نہیں ہے۔ اگر اللہ کو آپ مانتے ہیں تب تو آپ کو یہ بات سمجھنی چاہیے اور اگر نہیں مانتے تو آپ ایک Demographic survey کر لیں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ انسانوں کے اندر بہت زیادہ تنوع ہے۔ اور یہ نسخہ جو آپ نے استعمال کیا اور آپ کے لیے اس میں کامیابی کی راہ کھل گئی وہ لازمی نہیں ہے کہ دوسرا اختیار کرے اور اس کے لیے بھی وہ راہ کھل جائے۔ یعنی ایک تو اس لحاظ سے کہ انسانی فطرت اور انسانی شخصیت کے اندر جو تنوّع اللہ نے رکھا ہے یا آپ اللہ کو نہیں بھی مانتے تب بھی دکھتا ہے، نظر آتا ہے۔ آپ اس کی نفی کر دیتے ہیں گویا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک فیکٹری سے جیسے صابن کی ٹکیاں بن بن کے نکلتی ہیں، انسانوں کو بھی ایسے بنایا جا سکتا ہے، جبکہ ایسا ممکن نہیں ہے۔

تیسرا مسئلہ جو اس طرح کے لٹریچر اور گفتگو میں پیدا ہو گیا ہے وہ ہے اس میں روحانیت یا دین کو شامل کر دیا گیا کہ گویا دین کا بھی مقصود یہی ہے یعنی دین بھی یہ چاہتا ہے کہ آپ ''کامیاب'' ہوں۔ قرآن و حدیث اور صوفیانہ لٹریچر کو اس میں شامل کر دیا جاتا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ بھی یہی چاہتا ہے۔ کرسچین سمتھ امریکہ میں ایک سوشیالوجسٹ ہے، اس نے خاص طور پر امریکی Teenagers کی ایک Sociological study کی اور کہا کہ یہ جو لوگ ہیں ان کے اندر operative religion ہے۔ اس کا اس نے ایک نام رکھا اور کہا کہ وہ operative مذہب Moralistic therapeutic deism ہے۔ یہ تصور کیا ہے کہ ایک خدا ہے اس نے

انسانوں اور دنیا کو پیدا کیا اور خدا انسانوں سے بہت محبت کرتا ہے اور وہ انسانوں سے یہ چاہتا ہے کہ انسان خوش رہیں، انسان کامیاب ہوں۔ وہ جس کو امریکہ میں feel good expression کہتے ہیں یعنی انسان اپنے بارے میں اچھا سوچیں، اچھا خیال کریں۔ اور خدا کوئی بہت زیادہ انسانوں کی زندگی میں مداخلت نہیں کرتا اور اس خدا کی ضرورت بس ایک مسئلہ حل کرنے والے کی ہوتی ہے۔ جیسے آپ کو کوئی مسئلہ ہو جائے تو آپ ایک تھراپسٹ کے پاس جاتے ہیں، اس سے علاج معالجہ کرواتے ہیں، بس خدا کا عمل دخل اتنا ہی ہے۔ اور deism اس کو اس لیے کہا کہ اس میں خدا ایک زندہ حقیقت کے طور پر، ایک حیّ وقیوم ذات کے طور پر اس کائنات کو چلانے والا، اس کائنات میں لوگوں کو راہ دکھانے والا نہیں ہوتا۔ بلکہ کچھ اخلاقی باتیں ہیں اور وہ اخلاقی باتیں بھی اس طرح کی ہیں کہ جیسی ہمارے ہاں میڈیا میں عموماً اینکر پرسنز استعمال کرتے ہیں کہ خوش رہیں اپنا خیال رکھیں وغیرہ۔ گویا سب سے بڑی قدر یہی ہے کہ بس آپ کو خوش رہیں، خود کو وقت دیں۔ تو یہ جو تصورات ہیں، اس میں مذہب کو بھی بیچ میں لایا جاتا ہے۔ جس طرح امریکہ میں ایک خاص دور میں جس کو The gospel prosperity کہا جاتا تھا اس کو The gospel of health and wealth کہا جاتا تھا کہ اصل میں خدا یہی چاہتا ہے کہ آپ کے پاس پیسہ بے تحاشا ہو، آپ بہت صحت مند ہوں، آپ اپنے جسم پر توجہ دیں، اپنی جیب پر توجہ دیں۔ تو یہ جو چیز ہے ظاہر بات ہے اس سے یہ ہوتا ہے کہ جب آپ دنیاوی اغراض کے لیے ہی دین کو استعمال کرتے ہیں تو پھر اس سے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دنیا بھی حاصل نہیں ہو پاتی اور دین کا تصور تو ویسے ہی برباد ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ باتیں جو اس مقصد کے لیے نہیں کہی گئیں، جب وہ آپ توڑ مروڑ کر وہاں فٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو پھر اس سے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور ایک دولختی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر آپ دنیا چاہتے ہیں تو دنیاداروں کی بود و باش اور ان کا ڈسکورس اختیار کر کے آپ وہ چیزیں حاصل کر لیں، لیکن اس کے لیے آپ دینی دلائل تراشیں اور وہ ساری بات کریں تو ظاہر بات ہے اس سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

جاری ہے

*****

محمد نعیم ندوی صدیقی، ایم۔اے، رفیق دار المصنفین

ماخوذ: معارف، فروری ۱۹۷۳ء

سلطان عبدالحمید کی معزولی کا حقیقی سبب

ایک جدید انکشاف

تحقیق کا کام ہمیشہ آگے بڑھتا رہتا ہے بہت سے مسلمات و حقائق تحقیق کی کسوٹی پر آکر محض کذب و افترا ثابت ہوتے ہیں، ذیل کا مضمون بھی اسی کی ایک مثال ہے۔ سلطان عبدالحمید کے متعلق یہ عام شہرت ہے کہ وہ ظالم و جابر اور مطلق العنان حکمراں تھے، اسی کے نتیجے میں نوجوان ترکوں کی تنظیم "عثمانی انجمنِ اتحاد و ترقی" کے نام سے وجود میں آئی تھی، اور بقول خالدہ ادیب خانم: عبدالحمید کی تخت نشینی کا دن عثمانی خاندان کے لیے قومی یومِ ماتم کے طور پر منائے جانے کا مستحق ہے۔ لیکن کویت کے سرکاری ماہنامے مجلة العربي کے دسمبر ۱۹۷۲ء کے شمارے میں دمشق کے ایک فاضل سعید الافغانی کے قلم سے ایک طویل مضمون شائع ہوا ہے جس میں سلطان عبدالحمید کے ایک نادر دستخطی خط سے یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا ہے کہ انجمنِ اتحاد و ترقی دراصل یہودیوں کی ایجنٹ تھی اور سلطان کی معزولی محض اس بنا پر ہوئی تھی کہ انھوں نے فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک قومی وطن کے قیام کے مطالبے کو مسترد کیا تھا۔ رسالۂ مذکور نے سلطان کے اصل ترکی خط کا عکس بھی شائع کر دیا ہے، اس تحقیق کے سامنے آنے کے بعد سلطان کے متعلق عام بیانات بالکل بے وزن ہو جاتے ہیں اور ان کے عہدِ حکومت کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا رخ بدل جاتا ہے، قارئین معارِف کے لیے اس کا ترجمہ و تلخیص پیش کی جاتی ہے۔ دولتِ عثمانیہ کے مشہور حکمراں سلطان عبدالحمید ثانی کی معزولی کے حقیقی سبب کو واشگاف کرنے والی جو نادر تاریخی دستاویز ہم پہلی بار پیش کرنے جا رہے ہیں اس کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کے سلطان کے عہدِ حکومت پر ایک اجمالی تبصرہ کر دیا جائے تاکہ مورخین و محققین نے جن غلط بیانیوں سے کام لیا ہے اس کی حقیقت واضح ہو جائے۔

جب سلطان مراد خاں خامس کی معزولی کے بعد ۱۸۷۶ء میں شہزادہ عبدالحمید تخت نشین ہوئے، تو دولتِ عثمانیہ شدید داخلی و خارجی بحران سے دوچار تھی، سلطان نے عنانِ حکومت سنبھالتے ہی تمام مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی پوری جدوجہد کی، ان کے عہد میں سلطنتِ عثمانیہ کی زیرِ نگیں یورپی اور ایشیائی ممالک میں ریلوے لائن بچھائی گئی، متعدّد بندرگاہیں تعمیر ہوئیں اور بغیر کسی غیر ملکی تعاون کے دمشق اور مدینہ کے درمیان حجاز ریلوے کی بنا پڑی۔(۱) سلطان عبدالحمید کے عہد میں عرب کے بہت سے مشاہیر حکومت کے بلند مناصب پر فائز ہوئے، یہ ایک حقیقت ہے کہ عربوں کو سلطان کے بارے میں خصوصی تقرب حاصل تھا، چنانچہ ان کا سیکنڈ سیکریٹری احمد پاشا دمشق کا ایک عرب تھا، سلطان کے شیخ ابوالہدیٰ الصیادی بھی مضافاتِ حلب کے رہنے والے عرب تھے۔ سلطان کو عربوں سے اس حد تک شغف تھا کہ ان کے خاص حفاظتی دستے، فوجی جنرل اور محل کے ملازمین میں عربوں کی بڑی اکثریت تھی، اس التفات خصوصی کے نتیجے میں سلطان کو ترکی الاصل عوام کی مخالفت اور غم و غصے کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی عام داخلہ پالیسی کو ''عرب نواز اسلامی سیاست'' کا نام دیا جاسکتا ہے، سلطان عبدالحمید کی خارجہ پالیسی بھی جذبات، ناتجربہ کاری اور ناعاقبت اندیشی کی سیاست نہیں تھی، جیسا کے بعد میں انجمنِ اتحاد و ترقی کے نوجوان ترکوں Yong Turks نے مشہور کردیا تھا، بلکہ پختہ شعور، کامل تجربہ اور بالغ اندیشی کی سیاست تھی۔(۲) سلطان کے ایک شدید مخالف سید جمال الدین افغانی نے بھی اس کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے، وہ کہتے ہیں: ''میں نے انھیں امورِ جہاں بانی کی باریکیوں اور دُوَلِ یورپ کے عزائم سے مکمل طور پر باخبر دیکھا، وہ سلطنت کے خلاف ہر سازش سے آگاہ رہتے تھے۔ جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متحیر کیا، وہ ان کا جاسوسی کا مضبوط نظام ہے جس کی وجہ سے یورپین حکومتیں دولتِ عثمانیہ کے خلاف کوئی اہم قدم نہیں اٹھا سکتی تھیں، اور ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ سلطنتِ عثمانیہ کے حصے بخرے کرنا یورپی ممالک کی تباہی کے بغیر ممکن نہیں، اور جب یورپ نے ریاست ہائے بلقان کے بارے میں ترکی کے خلاف جنگ کرنے کے مسئلے پر اتفاق کرنے کی کوشش کی تو سلطان نے اپنی ذہانت اور عجیب و غریب دانشمندی سے ان طاقتوں کے ناپاک عزائم کو ناکام بنادیا''۔(۳)

ہرزل کی سلطان سے سودے بازی

۱۸۹۷ء میں صیہونی تحریک کے بانی ہرزل نے فلسطین مین یہودیوں کا ایک قومی وطن بنانے کے لیے عبدالمجید سے سودے بازی کی تھی،(۴) اس کے معاوضے میں سلطان کی خدمت میں ایک خطیر رقم پیش کرتے ہوئے یقین دلایا تھا کہ اگر سلطان سرزمین فلسطین میں یہودیوں کا وطن بنانے پر رضامند ہوجائیں تو سلطنتِ عثمانیہ کے ذمے تمام غیر ملکی قرضوں کو ادا کر دیا جائے گا، جو نادر دستاویز ہم پیش کر رہے ہیں اس سے بتصریح ثابت ہوتا ہے کہ سلطان نے ہرزل کی اس پیشکش کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا تھا، روس، فرانس اور انگلستان کی حکومتوں کو اس پر شدید غم وغصہ تھا کہ سلطان نے قسطنطنیہ اور بغداد کے درمیان ریلوے لائن بنانے کا ٹھیکہ ایک جرمن کمپنی کو کیوں دے دیا۔(۵) چنانچہ انھوں نے سلطنت کے مختلف عناصر کو عبدالحمید کے خلاف بغاوت کے لیے اکسایا اور اس کے لیے ان کی خفیہ مدد بھی کی، جس طرح یہ طاقتیں اس سے قبل ریاست ہائے بلقان میں کر چکی تھیں اور اسی سبب سے ترکی میں علیحدگی پسند جماعتیں ابھریں، ان سرکشوں کے رہنما بہت سے ایسے یہودی بھی تھے جو بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے، ان جماعتوں کے خفیہ اجلاس غیر ملکوں میں منعقد ہوتے تھے، انجمنِ اتحاد وترقی کے بانیوں نے بھی اپنے ابتدائی جلسے پیرس و جنیوا میں کیے تھے، غیر ملکی سفارت خانوں نے سلطان کے خلاف سازش اور بغاوت کو کامیاب بنانے کے لیے اپنے خزانوں کے منھ کھول دیے، اور انجمنِ اتحاد و ترقی کے یہودی الاصل فوجی افسروں کے ذمے سلطان کو معزول اور دستوری حکومت قائم کرنے کی ذمے داری سپرد کی گئی تھی، انگلستان اور فرانس خاص طور پر حکومت کے باغیوں کو پناہ دینے میں پیش پیش تھے، اور اس کا تختہ الٹنے کی لیے اپنے ملک میں کام کرنے کی کھلی چھوٹ دے رکھی تھی۔

جب سلطان عبدالحمید نے ہرزل کا مطالبہ مسترد کر دیا تو یہودیوں کو یقین ہوگیا تھا کہ جب تک عبدالحمید تخت نشین حکومت رہے گا فلسطین میں ان کے قومی وطن کا قیام ناممکن ہے، چنانچہ ترکی حکومت کا تختہ اور اس کے حصے بخرے کرنے کے لیے دو میدانون میں سرگرم عمل ہوگئے، بیرونی خصوصًا یورپین ممالک میں اپنی مشنریوں اور حکومت پر اپنے اثر و نفوذ کو استعمال کیا، اور اندرونِ ملک سلطنت کے مختلف عناصر؛ کرد، عرب، ارمن اور چرکس وغیرہ میں جداگانہ قومیت کا جذبہ ابھارا۔ ان کی کوشش بارآور ہوئیں۔ چنانچہ انجمنِ اتحاد وترقی نے اپنی خفیہ سوسائٹی کا

صدر دفتر سالونیکا میں قائم کیا۔ یہ شہر اس طرح کی خفیہ سرگرمیوں کے لیے نہایت موزوں تھا، یہاں تحریکِ انقلاب کو کامیاب بنانے کے لیے انجمن جو پروگرام منعقد کرتی، غیر ملکی طاقتیں اس کی پوری پشت پناہی کرتی تھیں،(۶) چند دنوں میں باغیوں کی خفیہ سازشیں علانیہ ظاہر ہونے لگیں، سالونیکا میں انجمنِ اتحاد و ترقی نے ۲۳ جولائی ۱۹۰۸ء کو علمِ بغاوت بلند کردیا اور سرکش فوج کی طرف سے ترکی کے صدرِ اعظم کو تار موصول ہوا کہ اگر پوری طور پر دستوری حکومت قائم نہ کی گئی تو انقلابی فوجیں قسطنطنیہ میں داخل ہوجائیں گی، جب سلطان کو یقینِ واثق ہوگیا کہ اب یہ شورش دبنے والی نہیں ہے، اور دولتِ عثمانیہ کے خلاف یورپین حکومتوں نے گہری سازش کرلی ہے تو اس نے ۲۴ جولائی ۱۹۰۸ء کو دوبارہ دستوری حکومت کا قیام منظور کرلیا۔(۷) عرب نوجوانوں میں جو قومی احساس غیروں نے غیر شعوری طور پر پیدا کردیا تھا وہ بھی ابھر آیا، غیر ملکی جماعتیں، تعلیمی ادارے اور سفارت خانے قومی بیداری کے نام سے اس کو ہوا دیتے تھے، سلطنتِ عثمانیہ میں بیرونی قوموں کے جو اسکول اور کالج پھیلے ہوئے تھے، انھوں نے اس موقعے کو غنیمت سمجھ کر نصرانی و یہودی طلبہ کے دلوں کو مسلمانوں کے رعب و خوف سے اتنا بھر دیا کہ ان کو عثمانی شہنشاہیت سے نفرت ہوگئی۔(۸) دولتِ عثمانیہ کے خلاف تمام شورشوں کے پسِ پردہ یہودیوں کا نمایاں ہاتھ ہوتا تھا، انھی نے غیر ترکی عناصر میں قومی شعور پیدا کیا اور ظلم و استبداد کے خلاف صف آرا ہونے کی حوصلہ افزائی کی۔ انجمنِ اتحاد و ترقی نے بھی عوام اور بالخصوص نوجوان طبقے کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ”آزادی، مساوات اور عدل“ کا نعرہ بلند کیا اور جھوٹا پروپیگنڈا کیا کہ سلطان عبدالحمید نہایت استبداد پسند اور مطلق العنان حکمران ہے، اس کے عہد میں ہزاروں آدمی قتل کردیے گئے، اور ہزاروں جیل خانوں میں قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے ہیں، ایسے حاکم کا معزول کیا جانا ازروے ایمان بے حد ضروری ہے۔ اس پروپیگنڈے کا اثر یہ ہوا کہ اندرونِ ملک اور پوری دنیا میں یہ خیال عام ہوگیا کہ ترکی عوام شدید گھٹن کے ماحول میں زندگی گذار رہے ہیں۔

جیسا کہ ناظرینِ کرام جانتے ہیں کہ سالونیکا کی باغی فوج پیش قدمی کرکے پایۂ تخت قسطنطنیہ میں داخل ہوگئی اور قصرِ یلدیز کا محاصرہ کرکے معزولی کی قرداد سلطان کے سامنے پیش کردی، آپ جانتے ہیں کہ اس قراداد کو سلطان تک پہنچانے والا کون تھا؟ انجمنِ اتحاد و ترقی کا ایک یہودی نژاد رکن قراصو! جیسے ہی سلطان کی معزولی اور دستوری حکومت کے قیام کا اعلان ہوا، پوری عثمانی مملکت میں شادیانے بجنے لگے، اور عنانِ حکومت انجمنِ اتحاد و ترقی کے

نوجوان ترکوں کے ہاتھوں میں آگئی، انھوں نے سلطان عبدالحمید کے خلاف جھوٹے الزامات اور افترا و بہتان کی مہم تیز کردی، پورا پریس اس پر پیگنڈے میں سرگرم ہوگیا کہ عبدالحمید نہایت ظالم و جابر، متعصب، استبداد پسند اور مطلق العنان حکمران ہے، اس کے دورِ حکومت میں ترکوں اور غیر ترکوں کے خون کا دریا بہایا گیا۔ ہزاروں بے گناہوں کو زندان میں ڈالا گیا، اسکول اور کالجوں میں دولتِ عثمانیہ کی جو تاریخ پڑھائی جاتی، اس میں عبدالحمید کے عہد کو نہایت مسخ کر کے پیش کیا گیا تھا، پروپیگنڈے کے نتیجے میں خیال عام ہوگیا کہ انجمنِ اتحاد و ترقی دراصل مملکتِ عثمانیہ کی نجات دہندہ ہے، اس نے ملک کو ایک نازک وقت میں جور و استبداد کے چنگل اور تباہی کے دہانے سے بچالیا، جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے، نوجوان ترکوں (Young Turks) نے حریت، مساوات اور عدل کے نام پر انقلاب کا علم بلند کیا تھا، لیکن بعد میں وقت نے خود ہی ان کے جھوٹے اصولوں کا کھوٹا پن ثابت کردیا، اور اس انجمن کے قائدین کی نااہلی کی بدولت سلطنتِ عثمانیہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فنا ہوگئی۔

ان واقعات پر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ فلسطین کا غم انگیز حادثہ پیش آگیا، اور اہلِ دانش کی نگاہوں میں واقعات و حقائق خود بخود منکشف ہوگئے، اگر سلطان عبدالحمید نے یہودیوں کا مطالبہ تسلیم کرلیا ہوتا تو آخری سانس تک بڑے اطمینان سے حکومت کرتا رہتا، اب اس حقیقت میں کس شک وشبہے کی گنجائش باقی رہ گئی ہے کہ حکومتِ ترکی کے خلاف تمام شورشیں اور انقلابی تحریکیں دراصل ایک صیہونی ریاست کے قیام کا دیباچہ تھیں؟ نوجوان ترکوں کے عہدِ حکومت میں ہمارے اساتذہ نے سلطان عبدالحمید اور انجمنِ اتحاد و ترقی کے بارے میں جو معلومات ہمیں فراہم کیں وہ سراسر کذب و افترا کا پلندہ تھیں، جس حقیقت کا ادراک ہم کو اب ہورہا ہے، دور اندیش عبدالحمید نے ساٹھ سال قبل ہی اس کو اپنی چشمِ بصیرت سے دیکھ لیا تھا، لیکن بدقسمتی سے سلطان کو کوئی ایسا شخص نہیں مل سکا جو اسی کی طرح معاملے کی تہ کو پہنچ سکتا، عبدالحمید کا تختِ حکومت دراصل صیہونیت کا شکار اور فلسطین کی راہ میں پہلی قربانی ثابت ہوا جس طرح حجاز کا سابق مرحوم فرمانروا حسین بن علی بھی اس راہ میں قربانی کا بکرا بنا تھا، جب اس نے فلسطین کے عربوں کے حقوق کے تحفظ میں زیادہ اہتمام کیا تو انگریزوں نے اسے تخت سے اتار کر قبرص میں جلاوطن کردیا۔

سلطان عبدالحمید کی معزولی کے وقت قصرِ یلدیز میں جو واقعات پیش آئے وہ ایک مقرب درباری زاہد پاشا

اکثر اپنے ہم نشینوں کو سنایا کرتا تھا، دمشق کے جن معمر بزرگوں نے ان تفصیلات کو زاہد پاشا سے زبانی سنا ہے انھوں نے خود راقمِ سطور سے اس کی پوری تفصیل بیان کی کہ جب انقلاب پسندوں کی شورش بے حد بڑھ گئی اور سالونیکا میں اعلان کر دیا گیا تو صدرِ اعظم نے فوراً سلطان کو اس سے آگاہ کیا، سلطان نے اس کے جواب میں صرف اتنا کہا: طَيِّبْ (یعنی اچھا)۔ پھر اس نے سلطان کو مطلع کیا کہ باغی قسطنطنیہ کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں، سلطان پھر طَيِّبْ کہہ کر خاموش ہو گیا، صدرِ اعظم تھوڑی دیر کے بعد سلطان کو خبر کرتا رہا کہ اب انقلابی فوج دارالسلطنت میں داخل ہو گئی ہے... اب وہ قصرِ شاہی کی طرف بڑھ رہی ہے... اس نے قصرِ یلدیز کا محاصرہ کر لیا ہے... اس کے جواب میں سلطان صرف ایک لفظ طَيِّبْ کہتا رہا، صدرِ اعظم سلطان سے بہت خوف کھاتا تھا، اس لیے اس کو مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑی۔ عثمانی فوج کے ایک اطاعت شعار افسر نے سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر باغیوں سے مقابلہ کرنے کی اجازت طلب کی، سلطان نے ان کو نہایت سختی سے روک دیا، تھوڑی دیر کے بعد دوبارہ اسی افسر نے دوبارہ آکر عرض کیا کہ ہمارے سپاہی مقابلہ کرنے کی اجازت چاہتے ہیں، عبدالحمید نے اس کے جواب میں جو کچھ کہا وہ اس کی صلح جوئی، نیکی و صلاحیت اور ایثار و قربانی کی بہت بڑی مثال ہے، اس نے کہا: ’’میں خوب جانتا ہوں کہ انقلابیوں کا مقصد یا تو میری معزولی ہے یا میرا قتل، اور ظاہر ہے میں فردِ واحد ہوں، جب میں تم کو مقابلہ کرنے کا حکم دے دوں گا تو تمھارے اور باغیوں کے ہاتھوں سیکڑوں افراد خاک و خون میں لوٹیں گے، اور تم سب اسی امت کے افراد ہو، اور یہ امت عن قریب پیش آنے والے شدائد و مشکلات میں تمھاری زیادہ ضرورت مند ہوگی‘‘۔ مذکورہ بالا جواب سے ’’استبداد پسند‘‘ سلطان عبدالحمید کی جو تصویر نظر کے سامنے آتی ہے وہ اس سے قطعی مختلف ہے جو اتحادی نوجوانوں کی پروپیگنڈا مشینری نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد پیش کی تھی۔

دستاویز اور اس کا واقعہ

شیخ محمود ابوالشامات سلسلۂ شاذلیہ کے مشہور صاحبِ نسبت بزرگ گزرے ہیں، ان کا مزار دمشق کے محلہ قنوات میں مرجعِ انام ہے، شیخ کے مریدوں میں قصرِ یلدیز کے مہتمم راغب رضا بے بھی تھے۔ جب شیخ قسطنطنیہ تشریف لاتے تو اپنے مرید کے پاس محل کے گوشے میں قیام کرتے۔ سلطان عبدالحمید جو سلطنت کی معمولی سے معمولی بات

سے آگاہ رہتے تھے، اپنے محل میں شیخ کے قیام سے کس طرح ناواقف رہتے، انھوں نے راغب رضا بے سے اس بارے میں پوچھا، اس نے اپنے مرشد کا تعارف کچھ اس طرح کرایا کہ سلطان بھی اس سے ملنے کا مشتاق ہوگیا، اور پھر ان سے مل کر اتنا متاثر ہوا کہ طریقۂ شاذلیہ میں ان سے بیعت کرلی، سلطان کے ساتھ قسطنطنیہ کے بہت سے معززین، قصرِ شاہی کے ملازمین اور سپاہی و فوجی بھی شیخ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے۔

جب معزولی کے بعد سلطان کو سالونیکا کے ایک محل میں رکھا گیا تو اس کے حفاظتی دستے میں شیخ ابوالشامات کا ایک مرید بھی تھا، اس کے واسطے سے سلطان اور شیخ کے درمیان خفیہ مراسلت ہوا کرتی تھی، چنانچہ سلطان عبدالحمید کا اسی قسم کا ایک اہم خط زمانے کی دست برد سے محفوظ رہ کر ہم تک پہنچا، اس تاریخی خط میں سلطان نے اپنی معزولی کے راز سے بہت صراحت کے ساتھ پردہ اٹھایا ہے۔

انجمنِ اتحاد و ترقی کے دورِ اقتدار میں شیخ نے اس خط کو ایک سربستہ راز کے طور پر محفوظ رکھا، شیخ کی وفات کے بعد ان کے صاحب زادوں نے بھی اس کی پوری حفاظت کی، اور سوائے چند ثقہ اہلِ تعلق کے کوئی اس سے واقف نہیں ہوا، یہاں تک کے جب اس دستاویزی خط پر مرورِ ایام کے اثرات ظاہر ہونے لگے تو بعض دمشقی احباب نے میری توجہ اس طرف منعطف کرائی، میں نے شیخ کے لڑکوں سے اس خط کو دینے کی درخواست کی، کیونکہ اب اس کو پوشیدہ رکھنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہ گیا تھا، اور حق کو منظرِ عام پر ہی لانا چاہیے تھا، تاکہ علما و محققین اپنی غلط تحقیقات کی تصحیح کرلیں، میں نے اس خط کا عکس لے کر اصل ترکی خط کو شکریے کے ساتھ شیخ کے ورثہ کو واپس کردیا ہے، اس خط کا عربی ترجمہ اسی عہد کے ایک ایسے اہلِ علم نے کیا ہے جو عربی و ترکی دونوں زبانوں پر کامل عبور رکھتے تھے، شیخ ابوالشامات کے ورثہ نے اصل ترکی خط کے ساتھ اس عربی ترجمے کو بھی حفاظت سے رکھا ہے، اب خط ملاحظہ فرمائیں:(۹)

”اس تمہید کے بعد میں آنجناب اور دوسرے اہلِ دانش کی خدمت میں تاریخ کی امانت کے طور پر ایک اہم معاملہ پیش کرتا ہوں، میں خلافتِ اسلامیہ سے کسی اور سبب کی بنا پر معزول نہیں کیا گیا۔ سوائے اس کے کہ نوجوان ترکوں کی انجمنِ اتحاد و ترقی کے لیڈروں نے مجھے دھمکیاں دیں اور بہت تنگ کیا جس کی وجہ سے مجبور ولاچار ہوکر مجھے خلافت چھوڑنی پڑی۔ بلاشبہہ اتحادیوں نے مجھ پر حد درجہ اصرار کیا کہ میں ارضِ مقدس فلسطین میں یہودیوں

کے لیے ایک قومی وطن کے قیام کا مطالبہ منظور کرلوں۔ ان کے اصرار و دھمکی کے علی الرغم میں نے کسی صورت میں اس کو قبول نہیں کیا، آخر میں انھوں نے بطورِ رشوت پندرہ کروڑ ڈالر سونے کی پیشکش کی، میں نے قطعی طور پر اس کو بھی ٹھکرا دیا اور انھیں درج ذیل قطعی جواب دیا: ''اگر تم پندرہ کروڑ انگریزی ڈالر سونے کے بجائے پوری دنیا کو سونے سے بھر کر مجھے دو تو بھی میں کسی طرح اس مطالبے کو منظور نہیں کر سکتا، میں نے تیس سال تک ملتِ اسلامیہ اور امتِ محمدیہ کی خدمت کی تھی، اور عثمانی خلفا و سلاطین میں سے میرے آبا و اجداد نے مسلمانوں کے صحیفۂ اعمال کو سیاہ نہیں کیا، اس لیے میں بھی تمھاری اس پیشکش کو کسی حال میں قبول نہیں کر سکتا''۔ میرے اس قطعی جواب کے بعد انھوں نے میری معزولی پر اتفاقِ رائے کر لیا، اور مجھے مطلع کیا کہ وہ جلد ہی مجھے سالونیکا کے ایک محل میں نظر بند کر دیں گے، میں نے ان کے اس عتاب کو گوارا کر لیا۔ میں خداوندِ قدوس کا ہزار شکر ادا کرتا ہوں کہ ارضِ فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام سے جو ابدی ننگ و عار لاحق ہوتا، میں نے عالمِ اسلام اور دولتِ عثمانیہ کو اس سے آلودہ کرنا قبول نہیں کیا، اور اس کے بعد جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا، میرا خیال ہے میں نے اس مسئلے پر صراحت کے ساتھ تمام باتیں عرض کر دی ہیں اور اسی پر اپنا یہ خط ختم کرتا ہوں۔ فی ۲۲ ایلول ۱۳۲۹ء۔ خادم المسلمین عبد الحمید بن عبد المجید''۔

سلطان نے اس خط میں یہودیوں اور ان کے ایجنٹ اتحادیوں (انجمنِ اتحاد و ترقی کے ارکان) کے اعمال پر جتنی صراحت سے روشنی ڈالی ہے اس سے زیادہ توضیح و تشریح کی گنجائش نہیں ہے، راقمِ سطور کو خود یاد ہے کہ جب پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاریاں برپا ہوئیں اور ترکی کے ساتھ جو حوادث پیش آئے، اس زمانے میں ترکی عوام سلطان عبد الحمید کے عہد کو بڑی حسرت سے یاد کرتے تھے، اور جب کسی مجلس میں اس دور کا ذکر آجاتا تو بار بار لوگ سقی الله تلک الأیام (یعنی خدا وہ زمانہ پھر لے آئے) کے الفاظ دہرایا کرتے تھے، اور اس وقت یہ عام خیال ہو گیا تھا کہ عبد الحمید کی معزولی نے در حقیقت ملک پر مصائب و شدائد اور بربادی کا دروازہ کھول دیا ہے۔

اب بھی جب کبھی راقم سطور کو عمر رسیدہ بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوتا ہے تو ان کی زبانوں سے اکثر عبد الحمید اور ان کے عہد کے لیے خیر و برکت اور ترحم کے کلمات سنتا ہے، اب لوگ انجمنِ اتحاد و ترقی کے نوجوان ترکوں اور ان کے پشت پناہ یہودیوں کے مکر و فریب کو بھول چکے ہیں، اور ان کا یہ عقیدہ پختہ ہو گیا ہے کہ

انجمنِ اتحاد و ترقی دراصل صہیونیوں کا ہراول دستہ تھی، اور اگر سلطان نے یہودیوں کے ایجنٹ اتحادیوں کے مطالبے کے آگے سر جھکا دیا ہوتا تو یہودی ریاست کا خواب ۱۹۴۸ء کے بجائے ۱۹۰۸ء ہی میں پورا ہو جاتا، اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ سلطان عبدالحمید (خدا ان کی تربت کو اپنے انوار سے مالا مال کرے) پہلا شخص ہے جس نے فلسطین کی دفاع میں جامِ شہادت نوش کیا۔(۱۰)

حواشی و حوالہ جات

(۱)فلسفۃ التاریخ العثمانی، ج ۲، ص ۱۲۶

(۲)فلسفۃ التاریخ العثمانی، ج ۲، ص ۱۲۹

(۳)خاطرات، جمال الدین افغانی، ص ۳۵

(۴)مترجم: ۱۸۹۷ء میں بیسل میں پہلی صیہونی کانفرس منعقد ہوئی تھی، جس میں ہرزل نے اعلان کیا کی بیت المقدس کو یہودیوں کا قانونی وطن بنانا چاہیے، اس کے بعد نشر و اشاعت کے ذریعے تحریک ترقی کرتی رہی، بیت المقدس کے یہودیوں کو منظم کیا گیا جنھوں نے عربی زبان تک بولنا اور لکھنا چھوڑ دیا اور عبرانی و سریانی زبان کی ترویج شروع کی۔

(۵)مترجم: ایشیاے کوچک میں جدید ذرائع حمل و نقل کی عدم موجودگی کے باعث سفر کرنا دقت طلب تھا، جس کی وجہ سے جرمنی کو تجارت میں بہت دشواری ہوتی تھی، عثمانی حکومت کے صدر مقام سے ایشیاے کوچک تک جانے کے لیے کوئی ریلوے لائن نہ تھی، چنانچہ ایک جرمن کمپنی نے ۱۸۹۳ء میں ایک ریلوے لائن انقرہ تک تعمیر کی، اس کی وجہ سے سفر اور تجارت میں بڑی سہولت پیدا ہو گئی، چنانچہ سلطان نے اس ریلوے لائن کو بغداد تک بڑھانے کی اجازت دے دی اور تعمیر کا کام ایک جرمن ریلوے کمپنی کے سپرد کر دیا گیا، اس ریلوے کی تعمیر سے فرانس اور برطانیہ دونوں کو تشویش پیدا ہو گئی، کیونکہ اس کی تعمیر سے نہ صرف ایشیاے کوچک میں جرمنی کا مکمل اقتصادی تسلط قائم ہو جاتا بلکہ مسوپوٹامیا اور خلیج فارس کی اقتصادی تسخیر کا بھی خطرہ تھا، جرمنی کے تاجر "بغداد ریلوے" کے جاری ہونے سے مشرقِ ادنیٰ کے بازاروں پر قابض ہو جاتے، اس کے علاوہ نہرِ سویز کے مقابلے میں اس ریلوے کے ذریعے تجارتی اشیا بہت کم وقت میں خلیجِ فارس تک بھیجی جا سکتی تھیں، حکومتِ برطانیہ کے

لیے زیادہ تشویش ناک بات یہ تھی کہ ممکن ہے جرمن حکومت "جرمن ریلوے کمپنی" کے تمام حقوق حاصل کر لے اور اس طرح ایک اقتصادی مسئلہ کہیں سیاسی حربہ نہ بن جائے، ان ہی وجوہ کے باعث روس، فرانس اور برطانیہ کو قسطنطنیہ میں جرمنی کا بڑھتا ہوا اثر ناگوار گزرا۔

(٦)فلسفۃ التاریخ العثمانی، ج۲، ص۱٦۷

(٨)فلسفۃ التاریخ العثمانی، ج۲، ص۱٦٨

(۹) مترجم: یہ خط کافی طویل ہے اور ایک مخلص مرید نے اپنے مرشد کو لکھا ہے، اس لیے خط کا ابتدائی اور آخری حصہ رسمی آداب واظہارِ عقیدت پر مشتمل ہے، جو عموماً مسترشد اپنے شیخ کے لیے ظاہر کرتے ہیں یعنی طویل آداب والقاب، قلبی ورود و اذکار کی پابندی کا ذکر اور سلام وتحیات وغیرہ، موضوع سے خارج ہونے کی بنا پر میں نے ان حصوں کو حذف کر دیا ہے۔

(۱۰)سلطان کی شہادت والی بات غالباً مصنف سے سہواً درج ہوگئی ہے، ورنہ یہ مشہور ومعروف ہے کہ سلطان کی وفات بیماری کے سبب ہوئی۔(ادارہ)

*****

مولانا حماد احمد ترک

شوکتِ سنجر و سلیم

عثمانی سلاطین کی سلسلہ وار تاریخ

قسط نمبر ۱۰

۲۳: احمد خان ثالث (۱۶۷۳۔۱۷۳۶ء)

سلطان احمد خان ثالث نہایت صاحبِ علم اور عابد و زاہد انسان تھے۔ علما کی قدر کرتے تھے، شعرا کی سرپرستی کرتے تھے اور خود بھی شاعر تھے۔ نجیبؔ ان کا تخلص تھا۔ احمد خان ثالث اپنے بڑے بھائی کے معزول ہونے پر ۱۷۰۳ء میں تخت نشین ہوئے۔ سلطان کو ینی چری کے باغیوں نے تخت پر بٹھایا تھا، چنانچہ ابتدائی زمانے میں انھیں خوب انعام و اکرام سے نوازا گیا، لیکن کچھ عرصے میں سلطان نے اپنے قدم جما لیے اور ینی چری کے خلاف انتقامی کارروائی شروع کر دی۔ بہت سے باغی قتل ہوئے اور باغیوں کے سرپرست صدرِ اعظم احمد پاشا و دیگر افسران برطرف کر دیے گئے۔ اس کے بعد صدرِ اعظم کے عہدے پر یکے بعد دیگرے بارہ افسران تعینات ہوئے۔ چند سالوں میں اس اہم عہدے کے بار بار تبدیل ہونے سے سلطنت کی خارجہ پالیسی پر منفی اثرات مرتب ہوئے، بالخصوص، روس کے سربراہ پیٹر اعظم کی سازشوں کا توڑ کرنے والا اور ان پر گہری نظر رکھنے والا کوئی نہ رہا۔ چنانچہ روس نے توسیع پسندانہ عزائم کا اظہار کرتے ہوئے عثمانی سرحدوں پر جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔

سلطنتِ عثمانیہ روس سے جنگ کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی اور روس بھی سویڈن کے شاہ چارلس کے خلاف زبردست جنگ میں الجھا ہوا تھا اس لیے ۱۷۰۵ء میں دونوں ممالک نے صلح کر لی۔ لیکن صرف چار سال بعد ہی شکست خوردہ شاہ چارلس نے بھاگ کر سلطنتِ عثمانیہ میں پناہ لی تو روس نے عثمانی سلطان کو شاہ چارلس کی حوالگی

کے لیے پیغام بھیج دیا۔ عثمانیوں نے روس کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا، چنانچہ دونوں ممالک نے ایک دوسرے کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ ۱۷۱۱ء میں بلطہ جی محمد پاشا عثمانی افواج کی قیادت کرتا ہوا مولڈیویا میں داخل ہوا۔ دوسری طرف شاہِ روس پیٹر اعظم طاقت کے نشے میں عثمانی افواج کی طرف بڑھتا رہا حتیٰ کہ ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں عثمانی افواج پہلے سے مورچہ بند تھیں۔ ایک طرف دریا تھا اور دوسری طرف دلدل، سامنے کی پہاڑیوں پر عثمانی توپیں نصب تھیں۔ یہاں پہنچ کر پیٹر کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ وہ پوری طرح عثمانیوں کے نرغے میں ہے اور اس کا لشکر بھی تعداد میں عثمانی لشکر سے کم ہے۔ اس موقعے پر پیٹر نے ماسکو میں سینٹ کے ارکان کو ایک خط لکھا جسے مشہور مؤرخ لارڈ ایورسلے نے نقل کیا ہے، اس خط سے بقول ڈاکٹر محمد عزیز ''زار کی حالتِ زار'' کا اندازہ ہوتا ہے۔ خط میں کہا گیا تھا کہ ہم بری طرح پھنس چکے ہیں، سامانِ رسد منقطع ہے، ہر لمحہ موت یا قید کا دھڑکا لگا رہتا ہے، خدا ہی کچھ کرے تو کرے۔ لیکن اس موقعے پر عثمانی سپہ سالار نے انتہائی سخت شرائط پر روس کی طرف سے پیش کی گئی صلح کی درخواست منظور کر لی اور یوں پیٹر کی جان بخش ہوئی۔

۱۷۱۵ء میں عثمانی لشکر صدرِ اعظم داماد پاشا کی قیادت میں موریا پر حملہ آور ہوا اور چند مہینوں میں جمہوریہ وینس کے تمام بڑے قلعوں پر قابض ہو گیا اور موریا سلطنتِ عثمانیہ کے زیرِ نگیں آ گیا۔ ۱۷۱۶ء میں داماد پاشا عثمانی فوج کے ساتھ آسٹریا کے بالمقابل آیا۔ آسٹریا کا لشکر مشہور سپہ سالار شہزادہ یوجین کی کمان میں تھا۔ عثمانیوں نے زبردست مقابلہ کیا اور قریب تھا کہ آسٹریا کا لشکر شکست کھاتا، داماد پاشا زخمی ہو گیا۔ اس کے زخمی ہونے سے عثمانی سپاہی بددل ہو گئے اور پسپا ہو کر بلغراد کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ داماد پاشا نے جامِ شہادت نوش کیا، جبکہ سپاہی جنگی سامان اور توپیں چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ شہزادہ یوجین عثمانیوں کو اس میدان میں شکست دے کر تمیسوار کی طرف بڑھا۔ تمیسوار آسٹریا میں عثمانیوں کا آخری قلعہ تھا۔ پانچ ہفتے کے محاصرے کے بعد قلعے میں محصور عثمانی سپاہیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ۱۷۷۷ء میں دوبارہ عثمانی لشکر خلیل پاشا کی قیادت میں یوجین کی فوج کے بالمقابل آیا لیکن اس بار بھی اذیت ناک شکست عثمانیوں کے حصے میں آئی۔ بیس ہزار سپاہی شہید ہوئے اور ایک سو تیس توپوں سمیت جنگی آلات کا بہت بڑا ذخیرہ دشمنوں کے ہاتھ لگ گیا۔ ۱۷۲۲ء میں سلطنتِ عثمانیہ اور روس میں ایران کی تقسیم پر تنازع ہوا اور دونوں نے اپنی فوجیں ایران میں داخل کر دیں، لیکن اگلے ہی سال دونوں نے ایران کی تقسیم پر اتفاق کر لیا۔ عثمانی

افواج ایران میں موجود رہیں اور منقسم خطے پر عثمانی سلطان کا حکم چلتا رہا، حتی کہ ۱۷۲۷ء میں نادر خان نے ایک لشکر کے ساتھ اصفہان پر چڑھائی کر دی۔ بعد ازاں عثمانی سلطان سے ایرانی مقبوضات کی واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ انکار پر نادر خان عثمانی افواج کے خلاف صف آرا ہوا۔ نادر خان ایرانی سردار تھا اور جنگی امور میں غیر معمولی مہارت رکھتا تھا۔ عثمانی افواج نادر خان کے مقابلے پر آئیں تو جلد ہی ان کے قدم اکھڑ گئے۔ ایرانی سپاہیوں نے بے شمار عثمانی سپاہی تہ تیغ کیے۔ یہ خبر قسطنطنیہ پہنچی تو ہر طرف غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور سلطان احمد خان ثالث کی معزولی کا مطالبہ زور پکڑنے لگا۔ اس سے قبل کہ حالات سنگین ہوتے، سلطان نے ۱۷۳۰ء میں استعفیٰ دے دیا اور خاموشی سے تخت اپنے بھتیجے محمود کے حوالے کر دیا۔ مجموعی طور پر احمد خان ثالث کے ستائیس سالہ دور میں خوش حالی اور امن وامان برقرار رہا۔ سلطان احمد ثالث کے عہد میں پہلا مطبع قائم ہوا۔ اسی طرح متعدّد صنعتیں، مسجدیں اور فلاحی عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ مطبع اس شرط پر قائم ہوا کہ قرآنِ مجید کی طباعت نہیں کی جائے گی۔ سلطان احمد خان ثالث، ان کے بھائی سلطان مصطفیٰ خان ثانی اور ان کے والد سلطان محمد خان رابع؛ تینوں کا عہد معزولی کے سبب ختم ہوا اور تینوں باغی فوج کی سازشوں کا شکار ہوئے۔

۲۴: محمود خان اول (۱۶۹۶۔ ۱۷۵۴ء)

محمود خان اوّل نے کبار علما سے علم کی تحصیل کی۔ فنِ تعمیر اور فنِ شعر میں خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ خود بھی شاعر تھے، سبقتی بطورِ تخلص استعمال کرتے تھے۔ ۱۷۳۰ء میں سابق سلطان کی معزولی پر تخت نشین ہوئے۔ اپنے عہد کے ابتدائی سالوں میں باغی فوج کو قابو کرنے پر توجہ مرکوز کی۔ اس دوران عثمانی لشکر ایرانی سپاہ سے برسرِ پیکار تھا۔ عثمانیوں کی پے در پے فتوحات سے گھبرا کر شاہِ ایران طہماسپ نے صلح کی درخواست کی اور ۱۷۳۳ء میں دونوں ممالک میں صلح ہو گئی۔ لیکن نادر خان کو یہ مصالحت پسند نہ آئی۔ اس نے شاہِ ایران کو تخت سے اتار کر اس کے بیٹے کو حاکم بنا دیا اور در پردہ تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اس نے فی الفور صلح کا معاہدہ منسوخ کر دیا اور عثمانیوں کے خلاف لشکر ترتیب دینا شروع کیا۔ ۱۷۳۳ء میں دونوں افواج میں مڈبھیڑ ہوئی جس میں عثمانی فوج غالب آ گئی، لیکن کچھ ہی عرصے بعد ایک اور معرکہ ہوا جس میں نادر خان نے عثمانیوں کو زبردست شکست دی اور عثمانی صلح پر مجبور

ہو گئے۔ ۱۷۳۶ء میں دونوں کے مابین صلح ہو گئی۔ ادھر عثمانی فوج ایران سے صلح کر کے فارغ ہوئی ہی تھی کہ روس نے اپنی فوجیں عثمانی حدود میں داخل کر دیں، چنانچہ ۲۸ مئی ۱۷۳۶ء کو سلطنتِ عثمانیہ نے روس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ روسی فوج نے عثمانی خطوں میں صرف لوٹ مار ہی نہیں کی بلکہ ہزاروں افراد قتل کر دیے۔ بے شمار مکانات جلا دیے گئے۔ ہر محاذ پر اور ہر قلعے پر عثمانیوں کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ نتیجتاً سلطنتِ عثمانیہ نے آسٹریا کو پیغام بھیجا کہ وہ روس کو صلح پر آمادہ کرے۔ آسٹریا مدت سے عثمانیوں کے کمزور ہونے کا منتظر تھا اور ماضی کی شکست کا انتقام لینے کے لیے پُر جوش تھا، وہ ایسا موقع کیونکر ضائع کرتا۔ آسٹریا نے بظاہر صلح کی بات چیت بھی شروع کر دی اور عثمانی سفیر کی روسی سفیر سے ملاقات کروائی، لیکن یہ صرف ایک ڈھونگ تھا۔ آسٹریا اس عرصے میں جنگ کی تیاری کر رہا تھا۔ بالآخر روس اور آسٹریا نے باہمی مشاورت سے محاذ طے کیے اور آسٹریا نے جنگ کا اعلان کر دیا۔ ۱۷۳۷ء کے اوائل میں ایک طرف جنرل میونخ نے اوکزاکوف میں اور دوسری طرف جنرل لاسکی نے کریمیا میں داخل ہو کر قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ روسی افواج نے سفاکیت کے وہ نمونے پیش کیے جو کبھی تاتاریوں کی یلغار کے موقعے پر دیکھنے میں آئے تھے۔ اگست ۱۷۳۷ء تک یہ خونی کھیل جاری رہا۔ ادھر جولائی ۱۷۳۷ء میں آسٹریا نے بھی ایک لشکر سرویا اور دوسرا بوسنیا کی طرف روانہ کر دیا۔ عثمانی افواج کے لیے یہ خبر کسی قیامت سے کم نہ تھی، متعدّد محاذوں پر برسرِپیکار رہنے کے باوجود عثمانی سپاہی مغلوب نہ ہوئے اور ثابت قدمی سے مقابلہ کرتے رہے۔ حالات کی سنگینی کے پیشِ نظر سپاہیوں کے ساتھ ساتھ شہریوں نے بھی دفاعی جنگ میں حصہ لیا۔ ایک سال کی معرکہ آرائی نے آسٹریا کے سپاہیوں کو حواس باختہ کر دیا اور انھیں اگست ۱۷۳۸ء میں پسپا ہو کر بلغراد میں پناہ لینی پڑی۔

دوسری طرف روسی افواج نے پھر عثمانی حدود کا رخ کیا اور وہی ظلم و جور کی رسم جاری رہی، گھر جل کر راکھ ہو گئے، مساجد منہدم ہو گئیں، صنعتیں تباہ ہو گئیں اور ہزاروں لوگ کام آ گئے۔ اس کے نتیجے میں شہر ویران، گلیاں سنسان اور دوست یار انجان ہو گئے۔ سب مال و متاع لپیٹ سپیٹ کر خزانے میں جھاڑو پھیر دی گئی۔ روسی جس طرح گزشتہ سال سیلِ رواں کی مانند ہر شے کو بہا لے گئے تھے، اس حملے میں بھی وہ اسی غرور کے ساتھ عثمانی مقبوضات میں داخل ہوئے اور اپنی جھونک میں آگے بڑھتے چلے آئے، لیکن جلد ہی انھیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ گزشتہ حملہ اچانک، غیر علانیہ اور بالکل غیر متوقع تھا، اس لیے عثمانی سپاہی اپنے دفاع میں کچھ نہ کر سکے۔ بہر

حال، اب صورتِ حال مختلف تھی۔ عثمانی فوج دفاع کی بھرپور تیاری کے ساتھ محاذ پر موجود تھی اور خاص طور پر صدرِ اعظم کی قیادت میں دو لاکھ سپاہی کیل کانٹوں سے لیس ہو کر آسٹریا کے خلاف شان دار فتح حاصل کر چکے تھے۔ روس کو آسٹریا کی شکست کی خبر نے دہشت میں ڈال دیا۔ عثمانیوں کی یہ فتح یقیناً غیر متوقع تھی۔ روسی افواج صرف اسی امید پر کامیابی کے خواب دیکھ رہی تھیں کہ صدرِ اعظم کی فوج آسٹریا سے الجھی رہے گی اور روس بہ آسانی اپنے اہداف کی تکمیل کر لے گا۔

۱۷۳۹ء میں آسٹریا نے صدرِ اعظم کے ساتھ صلح نامے پر دستخط کر دیے اور یوں پورا منظر نامہ تبدیل ہو گیا۔ جنرل میونخ اس صلح پر بہت سیخ پا ہوا لیکن مجبوراً روس کو بھی صلح کی میز پر آنا پڑا۔ ۱۷۴۰ء میں سلطنتِ عثمانیہ نے پولینڈ اور فرانس سے بھی معاہدہ کر لیا۔ اس کے بعد طویل عرصے تک یورپ کے ساتھ جنگ کا مرحلہ پیش نہیں آیا۔ ۱۷۴۳ سے ۱۷۴۶ء تک ایران کے ساتھ جھڑپیں ہوتی رہیں لیکن یہ بھی صلح پر اختتام کو پہنچیں۔ اس دور میں سلطنتِ عثمانیہ نے اپنا کھویا ہوا وقار پھر سے حاصل کر لیا۔ سلطنت میں خوش حالی کا دور دورہ تھا، خزانہ پُر تھا۔ سلطان محمود اوّل کا یہ زمانہ ان کی وفات تک امن و امان سے گزر گیا۔ دسمبر ۱۷۵۴ء میں سلطان کی وفات ہوئی۔ اسی دوران حجاز میں وہابی تحریک نے سر اٹھایا۔ اس تحریک کے جذباتی، متشدد اور خود ساختہ تصورِ توحید کے علم بردار افراد نے ہر طرف ہلچل مچا دی۔ بدعات کے خلاف اٹھنے والی اس تحریک نے ردِ عمل میں بہت سی درست چیزوں کی بھی نفی کر دی۔ عثمانی سلطان محمود خان اوّل نے اسے روکنے کی بھرپور کوشش کی لیکن ان کے عہد میں یہ پھیلتی چلی گئی۔

۲۵: عثمان خان ثالث (۱۶۹۹ـ۱۷۵۷ء)

سلطان عثمان خان ثالث علمِ طب اور علمِ ادب میں خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ ۱۷۵۴ء میں تخت نشین ہوئے۔ سلطان جس عہد میں تخت نشین ہوئے، وہ عہد پُر امن تھا، چنانچہ سلطان نے اندرونی امور کو بہتر کرنے پر خاص توجہ دی۔ 'ینا سیر' میں عظیم الشان قلعے کی تعمیر سلطان عثمان ثالث کے عہد میں مکمل ہوئی۔ ڈینمارک کے ساتھ تجارتی معاہدہ ہوا۔ سلطان نے موسیقی اور دیگر اسلام مخالف امور کو ممنوع قرار دے دیا۔ خواتین کو پابند کیا کہ وہ بازاروں میں زیب و زینت کے ساتھ نہیں گھوم سکتیں۔ غیر مسلم خواتین کے لیے لازم قرار دیا کہ وہ مسلمان خواتین

کے لباس سے مشابہ لباس نہ پہنیں تاکہ دونوں میں فرق واضح رہے۔ دکان داروں اور مختلف پیشہ وروں کے لیے بھی خاص لباس متعیّن کیا۔ رشوت خور اور دھوکے باز افسروں اور تاجروں کے خلاف زبردست مہم چلائی۔ مساجد، مسافر خانے، سرکاری دفاتر اور پانی کی سبیلیں تعمیر کروائیں۔ سلطان عثمان خان ثالث کے عہد میں کوئی جنگ تو نہیں ہوئی البتہ دو اہم واقعات ہوئے: ایک تو یہ کہ ان کے عہد کے آغاز میں غضب کی سردی پڑی۔ ایسی سردی استنبول میں کم ہی دیکھی گئی۔ ٹھنڈ کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ خلیج کا پانی مکمل جم گیا تھا اور لوگ اسے پیدل عبور کرتے تھے۔ دوسرا اہم واقعہ یہ ہوا کہ سلطان کے عہد میں استنبول میں آگ لگ گئی اور یہ استنبول کی تاریخ میں آگ لگنے کے چند بڑے واقعات میں سے ایک ہے جس میں ایک چوتھائی استنبول خاکستر ہو گیا۔ یہ آگ ۲۸ ستمبر ۱۷۵۵ء کو لگی تھی۔ ابھی اس حادثے کی تلافی بھی نہ ہو پائی تھی کہ اگلے سال جولائی میں اس سے بھی بڑی آگ لگ گئی۔ یہ دوسرا واقعہ استنبول میں آگ لگنے کا سب سے بڑا واقعہ شمار کیا جاتا ہے جس میں تین چوتھائی شہر راکھ کا ڈھیر بن گیا تھا۔ اس کے بعد از سرِ نو شہر کی تعمیر کی گئی۔ ۱۷۵۷ء میں سلطان عثمان خان ثالث کی وفات ہوئی۔

۲۶: مصطفیٰ خان ثالث (۱۷۱۷ء۔ ۱۷۷۴ء)

سلطان مصطفیٰ خان ثالث اُن عثمانی سلاطین میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے حصولِ علم میں بہت محنت کی۔ سلطان نے دینی و دنیاوی ہر دو قسم کے علوم میں مہارت پیدا کی۔ علمِ ادب، تاریخ، جغرافیہ، فلکیات، علمِ طب، اسی طرح عسکری مہارتیں اور انتظامی امور الغرض تمام شعبوں کے ماہرین سے یہ علوم و فنون حاصل کیے۔ آپ ۱۷۵۷ء میں تخت نشین ہوئے۔ ابتدائی زمانے میں ریاست کو مالی اور عسکری طور پر مضبوط کرنے کے لیے خصوصی منصوبے تشکیل دیے۔ عدالتوں کو شرعی قوانین پر عمل درآمد کا پابند کیا۔ یہودی و نصرانی تاجر جو غیر قانونی تجارت میں ملوث تھے ان کا تعاقب کیا۔ سلطان مصطفیٰ خان نے عسکری قوت میں اضافے اور ترقی کے لیے ایک عسکری مدرسہ بھی قائم کیا۔ ایک اہم کام سلطان نے یہ کیا کہ حاجیوں کی شکایات کے ازالے پر خصوصی توجہ دی اور حج کے راستوں کو لٹیروں سے محفوظ رکھنے کے لیے اقدامات کیے۔ ۱۷۶۶ء میں استنبول میں زلزلے سے بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی۔ اس حادثے سے کئی اہم اور تاریخی عمارتیں متاثر ہوئیں جن میں مسجد سلطان فاتح اور مسجد حضرت ابوایوب

انصاری رضی اللہ عنہ بھی شامل تھیں۔ سلطان نے تباہ شدہ مکانات کی تعمیرِ نو کا اہتمام کیا۔

سلطان مصطفیٰ نے راغب پاشا کو صدرِ اعظم مقرر کیا۔ راغب پاشا کی امورِ سلطنت میں مہارت بے مثال تھی۔ عوام کی فلاح و بہبود اس کی اوّلین ترجیح تھی۔ راغب پاشا نے اسپتال اور کتب خانہ تعمیر کیا۔ آمد و رفت اور نقل و حمل کے ذرائع بڑھانے پر خصوصی توجہ دی۔ کئی ترقیاتی منصوبے راغب پاشا کے پیشِ نظر تھے، لیکن ۱۷۶۳ء میں اس کے انتقال کے بعد یہ منصوبے ادھورے رہ گئے۔

۱۷۶۴ء میں روس ایک بار پھر عثمانی مقبوضات میں دراندازی کرنے لگا اور رفتہ رفتہ روسی جارحیت بڑھتی گئی، حتیٰ کہ ۱۷۶۸ء میں روسی مظالم سے تنگ آکر سلطان نے دیوان منعقد کیا اور روس کے خلاف اعلانِ جنگ پر مشاورت کی۔ سوائے صدرِ اعظم محسن زادہ پاشا کے سب نے فی الفور اعلانِ جنگ پر اتفاق کیا۔ محسن زادہ کی مخالفت کے نتیجے میں انھیں برطرف کرکے امین پاشا کو صدرِ اعظم مقرر کیا گیا۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ اعلانِ جنگ میں بہت عجلت کا مظاہرہ کیا گیا کیونکہ ابھی عثمانی فوج منتشر تھی، جنگی ساز و سامان روس کے مقابلے کے لیے وافر نہیں تھا، قلعوں کی مرمت جاری تھی۔ سونے پر سہاگہ، لشکر کا سالار صدرِ اعظم امین پاشا جو کہ سلطان کا داماد بھی تھا، جنگی امور سے یکسر نابلد تھا۔ اس نے لشکر کی روانگی کے وقت ہی لشکر میں موجود سرداروں پر واضح کردیا تھا کہ میں جنگی حکمتِ عملی اور حرب و ضرب کی تدبیروں سے ناواقف ہوں، اس باب میں میرا کوئی تجربہ نہیں، اس لیے آپ سب مشورے سے طے کرلیں کہ کہاں پڑاؤ ڈالنا ہے۔ جب مشاورت ہوئی تو ہر ایک نے الگ تجویز پیش کی اور فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا۔ یہی حال میدانِ جنگ میں ہوا۔

صدرِ اعظم کے احمقانہ فیصلوں پر سلطان نے اسے معزول کرکے واپس بلالیا۔ اس معرکے میں بعض مقامات پر عثمانیوں کو جزوی فتح نصیب ہوئی لیکن مجموعی طور پر ۱۷۷۱ء اور ۱۷۷۲ء میں عثمانی افواج کو بحری و بری ہر دو محاذوں پر بے انتہا نقصان اٹھانا پڑا۔ ہزاروں سپاہی مارے گئے، بحری بیڑا جلا دیا گیا اور جنگی سامان روسیوں کے قبضے میں آگیا۔ اس دوران ترکوں کی جانب سے بارہا صلح کی پیش کش کی گئی لیکن تمام کوششیں رائیگاں چلی گئیں۔ اس موقعے پر سلطان کو محسن زادہ پاشا کی قابلیت کا ادراک ہونے لگا۔ سلطان نے دوبارہ محسن زادہ پاشا کو صدرِ اعظم کے عہدے پر بحال کیا اور لشکر کی قیادت اسے سونپ دی۔ محسن زادہ پاشا نے ترک سپاہیوں میں نئی روح پھونک دی اور سپاہی ایک

بار پھر عزم واستقلال کے ساتھ روسیوں کے خلاف ڈٹ گئے۔ اب کی بار عام شہریوں نے بھی سپاہیوں کا ساتھ دیا اور روسی فوج پسپا ہونے لگی۔ ۱۷۷۳ء کے آخر میں کئی محاذوں پر محسن پاشا فتح اپنے نام کر چکا تھا۔ ابھی روس سے جنگ جاری تھی کہ دسمبر ۱۷۷۳ء میں سلطان مصطفیٰ خان ثالث دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

جاری ہے

کتابیات

السلاطين العثمانيون، راشد كوندوغدو،الناشر: دار الرموز للنشر،إسطنبول،۲۰۱۸ء

آلبوم پادشاہانِ عثمانی، مترجم: میلاد سلمانی، ناشر: انتشاراتِ قَقنُوس، استنبول، ۲۰۱۵ء

تاریخِ سلطنتِ عثمانیہ، ڈاکٹر محمد عزیر، ناشر: کتاب میلہ، ۲۰۱۸ء

سلطنتِ عثمانیہ، ڈاکٹر علی محمد الصلابی، مترجم: علامہ محمد ظفر اقبال، ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور، جون ۲۰۲۰ء

*****

صوفی جمیل الرحمٰن عباسی

بیت المقدس کا تاریخی خاکہ

قسط نمبر ۲۴

فلسطین میں مسلمانوں کی زمینوں پر یہودی قبضے کا معاملہ بہت گھمبیر ہو چکا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں حکومتِ برطانیہ نے اس مسئلے کے حل کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی جو جانسن کروسبی کے نام سے مشہور ہوئی۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ مسلمانوں میں بے چینی بڑھتی جا رہی ہے۔ زرعی زمینیں ان کے ہاتھوں سے نکلتی جا رہی ہیں۔ کہیں تو اپنے قرضوں اور کہیں سرکاری محصولات کی ادائی کے لیے زمینیں اونے پونے بیچنے پر مجبور ہو رہے ہیں اور ان میں غربت و افلاس عام ہو رہا ہے۔ کمیٹی کی رپورٹس کو سنجیدگی سے لیا ہی نہیں گیا اور نہ ہی اس کا کوئی ارادہ نظر آتا تھا چنانچہ اس کارروائی سے بھی مسلمانوں کے مسائل حل نہیں ہوئے۔ اسی دوران دیوارِ گریہ کے حادثے کی تحقیقات مکمل ہوئیں اور جولائی ۱۹۳۰ء میں پرتشدد کارروائیوں کے الزام میں سترہ فلسطینیوں کو سزائے موت دی گئی جب کہ دوسری طرف صرف ایک یہودی کو سزائے موت کا فیصلہ سنایا گیا لیکن بعد میں اس کی سزا کو بھی عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس پر پھر مظاہروں اور کانفرنسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس نئی لہر کو روکنے اور مسلمانوں کو تسلی دینے کے لیے برطانوی وزیرِ استعماریات لارڈ پاسفیلڈ نے فلسطین میں امن و امان بحال کرنے کے لیے ایک سیاسی لائحہ عمل پر مشتمل وائٹ پیپر شائع کیا۔ اس میں کسی حد تک یہودی ہجرت کی تحدید اور عربوں کے زرعی و معاشی تحفظ کی بات کی گئی۔ جس پر یہودی اکابر بالخصوص وائزمین نے بھرپور لابنگ کی اور برطانیہ کے مختلف سیاست دانوں مثلاً چرچل، چیمبرلین اور بالڈوین وغیرہ کو اپنی مدد پر آمادہ کیا جن کی مداخلت سے وزیرِ اعظم میکڈونلڈ نے فروری ۱۹۳۱ء میں برطانوی اسمبلی میں ایک تقریر کی۔ اس نے تقریر میں وائٹ پیپر کے بارے میں کچھ وضاحتیں کیں جو اصل میں اس کی تنسیخ پر مشتمل تھیں۔ اس نے قرار دیا کہ یہودی ہجرت کو ہر حال میں جاری رکھا جائے گا اور

اس کے منافی کوئی عمل قابلِ قبول نہیں ہو گا۔ اس نے کہا کہ ہم پوری تحقیق سے وہ زمینیں دریافت کریں گے جہاں یہودی مہاجرین آباد کیے جاسکتے ہیں۔ اس نے یہود کی عرب کارکنوں کو ملازمتیں نہ دینے کی عمومی یہودی پالیسی کی بھی حمایت کی۔ اس طرح اس نے لارڈ پاسفیلڈ کی اس ساری محنت کو ضائع کر دیا جو اس نے ۱۹۲۹ء کے فسادات کے بعد عمومی بہتری لانے کے لیے کی تھی۔

یہودی سیاسی تحریک مصححین revisionists اور اس کا سربراہ ولادی میر جابو تینسکی، عالمی صیہونی تنظیم کے سربراہ وائزمین سے کچھ اختلاف رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہمیں جلد از جلد یہود کی قومی ریاست کے قیام کا اعلان کر دینا چاہیے۔ اس کے لیے دریائے اردن کا کنارہ کافی ہے جب کہ عالمی صیہونی تنظیم کا خیال تھا کہ ہمیں جلدی نہیں کرنی چاہیے بلکہ زیادہ سے زیادہ اراضی ہتھیانے کے بعد کسی مناسب موقعے پر یہودی قومی ریاست کے قیام کا اعلان کرنا چاہیے۔ ۱۹۳۰ء کے وائٹ پیپر کی اشاعت کے موقعے پر وائزمین کی مقبولیت میں کچھ کمی ہوئی چنانچہ جولائی ۱۹۳۱ء میں عالمی صیہونی تنظیم کی سربراہی ناحوم سوکولوف کے حصے میں آئی۔ تاہم وائزمین اپنی موثر شخصیت اور تعلقات کے بل بوتے پر عالمی سطح پر یہودی قومی ریاست کے قیام کے لیے کوشاں رہا اور اس نے میکڈونلڈ کے تعاون اور اس کی توضیحات سے صورتِ حال کو سنبھالا دے دیا۔ ۱۹۳۰ء تک یہودی مہاجرین کی تعداد ایک لاکھ کے برابر تھی۔ میکڈونلڈ کی نئی پالیسی کے تحت ہجرت میں بہت اضافہ ہوا اور جلد ہی یہودیوں کی تعداد دو لاکھ سے متجاوز ہو گئی، غیر قانونی آباد کار اس سے الگ تھے۔

فلسطین میں برطانوی ہائی کمشنر جو ہن چانسلر نے مسلمانوں کے معروف مطالبے ''مجلسِ تشریعی'' کی جانب کچھ پیش رفت شروع کی۔ حکومتِ برطانیہ کئی موقعوں پر اس کا وعدہ کر چکی تھی۔ مجلسِ تشریعی سے مراد قانون ساز اسمبلی سے مشابہ ادارہ تھا جو داخلی خود مختیاری کے اصول کے تحت قانون سازی کر سکتا ہے اور جس میں ہر طبقے کو اس کی آبادی کے بقدر نمائندگی دی جاتی تھی۔ اس پیش رفت سے یہودی سخت ناراض ہوئے۔ انھوں نے ساز باز کر کے جو ہن چانسلر کو اس کے منصب سے ہٹوا دیا اور اس کی جگہ وائزمین کی مشاورت سے سر آر تھر گرین فل واکھوب کو کمشنر مقرر کیا گیا۔ یہود نے اس کی حمایت کی اور وائزمین نے اسے اب تک سب سے بہترین کمشنر قرار دیا۔ مسلمانوں نے بجا طور پر محسوس کیا کہ کمیٹیوں کا قیام اور پے در پے برطانوی اعلانات اصل میں وقت گزاری اور مسلمانوں کی منزل کھوٹی کرنے

کی سازش کے سوا کچھ نہیں۔ چنانچہ متعدّد اخبار برطانیہ پر تنقید کرنے لگے جس کی پاداش میں بہت سے اخباروں کے اجازت نامے منسوخ کر دیے گئے۔ فلسطینی صحافیوں کی ایک کانفرنس منعقدہ ۱۹۳۱ء میں مسلمانوں سے مفاہمت ترک کرنے اور مقاومت میں آگے بڑھنے کی اپیل کی گئی۔ اس پر نابلس میں بڑے مظاہرے ہوئے جن پر حکومتی اداروں نے تشدد کیا اور بہت سارے مظاہرین زخمی ہوئے۔ ۲۷ رجب ۱۳۵۰ھ شبِ معراج بہ مطابق ۷ دسمبر ۱۹۳۱ء؛ مسلمانوں نے ایک اسلامی کانفرنس کا انعقاد کیا جس میں بارہ شہروں سے مندوبین شریک ہوئے۔ مفتی امین الحسینی نے افتتاحی خطاب میں مسلمانوں اور اسلام کے لیے فلسطین کی اہمیت واضح کی، کانفرنس نے قدس میں مسلمانوں کی یونی ورسٹی اور ایک زرعی کمپنی کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ جو مسلمانوں کی زمین یہودیوں کے قبضے سے چھڑانے کا کام کرے گی۔ لیکن ان دونوں امور کے لیے کوئی عملی پیش رفت نہیں ہو سکی۔ مصنفین کا اندازہ ہے کہ مالدار مسلمان حکومت کی سختی کے سبب ان امور کے لیے مال فراہم نہ کر سکے۔

جمعیتِ نوجوانانِ عرب اور جمعیتِ استقلال نے متحدہ فلسطین کی آزادی کے لیے کام کرنے کا بیڑا اُٹھایا اور ان سرکردہ لوگوں کو مدعو کیا جو پچھلی کانفرنسوں میں شامل رہے تھے۔ عونی عبدالہادی کے گھر پر پچاس کے قریب لوگ جمع ہوئے۔ انھوں نے اس پر اتفاق کیا کہ شہری تنظیموں اور بلدیاتی اداروں میں متحرک ہو کر فلسطینی اپنے قومی مقاصد سے پیچھے رہتے جا رہے ہیں۔ استعمار کے خلاف مقاومت، عربی خطوں کے حصے بخرے کیے بغیر مکمل آزادی حاصل کرنے اور عربی ثقافت و معیشت کو بہتر کرنے کے لیے کام کرنے کا عہد کیا۔ انھوں نے تعلیم، صنعت و زراعت اور مسلمانوں کی معاشی بہتری کے لیے مالیاتی فنڈ کے اجرا کے اعلانات کیے۔

بیداری اس لہر کو محسوس کر کے ہائی کمشنر واکھوب نے مسلمانوں سے رابطہ کیے اور انھیں اس پر قائل کرنا شروع کیا کہ ان کے مقاصد کے حصول کا راستہ مقاومت نہیں بلکہ مفاہمت ہے۔ اس نے خیال پیش کیا کہ مسلمانوں کو انگریزوں اور یہودیوں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے۔ اسی قربت سے جملہ مسائل ختم ہوں گے، اقتصادی بہتری آئے گی اور قومی ترقی کے ساتھ ساتھ جمہوری حکومت کے قیام میں مدد ملے گی۔ اس نے حکومتی کمیٹیوں مثلاً زراعتی کمیٹی، صنعتی کمیٹی، وغیرہ میں مسلمانوں اور یہودیوں کو باہم مل کر کام کرنے کے مواقع فراہم کیے۔ عام مسلمانوں میں اس سوچ کی مخالفت کے باوجود کئی مسلمان ''مفاہمت'' کی اس نئی لہر کی لپیٹ میں آ گئے یہاں

تک کہ قومی مقاصد کے علم بردار عونی عبد الہادی بھی بعض حکومتی کمیٹیوں کے رکن بن گئے۔ مسٹر واکھوب نے مناسب موقع جانتے ہوئے حکومتِ برطانیہ کو تجویز دی کہ مجلسِ قانون ساز کا قیام عمل میں لے آیا جائے تا کہ مسلمانوں میں مخاصمت کے بجائے مفاہمت کو فروغ ملے لیکن ان کی یہ تجویز بار نہ پا سکی۔

مسلمانوں کی اکثریت نے اس مفاہمانہ پالیسی کو ناپسند کیا۔ ۱۹۳۲ء میں یافا شہر میں فلسطینی نوجوانوں کی ایک کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس میں یہودیوں اور حکومت کے ساتھ تعاون پر کڑی تنقید کی گئی اور اس سے اجتناب پر زور دیا گیا۔ کچھ عرصے بعد فلسطین کی مشہور شخصیت موسیٰ کاظم الحسینی نے مختلف سیاسی شخصیات کو جمع کیا اور کانفرنس نے اس پر اتفاق کیا کہ مسلمانوں کے جملہ مسائل کی جڑ یہودیوں کی ہجرت ہے۔ مسلمانوں کو اس کے خلاف ایکا کر کے اسے روکنے کا موقف اختیار کرنا چاہیے۔ مارچ ۱۹۳۳ء میں جناب مفتی امین الحسینی کی سربراہی میں ایک کانفرنس کا انعقاد، یافا شہر میں ہوا جس میں چھے سو سرکردہ مسلمانوں نے شرکت کی۔ حکومت کی نافرمانی، ٹیکس نہ دینے اور بائی کاٹ وغیرہ پر مشاورت ہوئی۔ اگرچہ ٹیکس نہ دینے پر اتفاق نہ ہو سکا لیکن حکومتی کمیٹیوں کا بائیکاٹ جاری رکھنے کا اعلان کیا گیا۔ بائیکاٹ کی پیش رفت کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ یہودی زراعتی کمپنیوں کے مقابلے میں مسلمانوں نے اپنی زرعی زمینوں کو واگزار کرانے اور ان کی آباد کاری کے لیے ایک کمپنی شَرِكَةُ إنقاذ الأراضي کے نام سے قائم کی تھی۔ کانفرنس نے مسلمانوں سے درخواست کی کہ وہ اس کمپنی کے شیئرز خریدیں۔ اسی طرح مسلمانوں کی امداد کے لیے صندوق الأمة کے نام سے ایک فنڈ کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔ مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ اس فنڈ میں عطیات جمع کرائیں۔ اگلے ہی مہینے اپریل میں یہودی ہجرت کا ایک نیا طوفان بدتمیزی کھڑا ہو گیا جس میں چار ہزار یہودی قانونی طور پر جب کہ دس ہزار یہودی غیر قانونی طور پر فلسطین میں داخل کیے گئے۔ مسلمان زبانی اور اخباری احتجاج کے اہتمام میں لگے ہی تھے کہ اگست ۱۹۳۳ء میں یہودی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس میں انھوں نے ہٹلر کے ہاتھوں جرمنی سے یہودیوں کے (ماقبل جنگِ عظیم دوم) ''جبری انخلا'' کو دلیل بنا کر حکومت برطانیہ سے یہودی قومی ریاست کے قیام کے لیے پیش رفت بڑھانے اور یہودی ہجرت پر سے ہر قسم کی پابندی اور حصولِ اجازت کے قانون کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس سے مسلمانوں میں اضطراب بڑھ گیا اور اکتوبر ۱۹۳۳ء میں قدس میں ایک بڑا مظاہرہ کیا گیا۔ شیخ موسیٰ کاظم اپنے ساتھیوں کے ساتھ حرمِ مقدس سے نکل کر جلوس میں شامل ہوئے۔

پولیس نے روکنے کی کوشش کی تو پولیس اور مظاہرین کے درمیان تصادم ہوا۔ جس میں پینتیس مسلمان جبکہ پانچ سپاہی زخمی ہوئے۔ ستائیس اکتوبر کو یافا اور دوسرے شہروں میں مظاہرے شروع ہو گئے۔ پولیس اور دیگر سرکاری اداروں نے ان مظاہرین کے خلاف ناجائز طور پر تشدد کا راستہ اختیار کیا۔ اگلے دن یافا کی جامع الکبیر میں لوگ جمع ہونا شروع ہوئے اور قدس میں خواتین کی بڑی تعداد جمع ہو گئی۔ اسی طرح تنظیم شباب الوطني کے بہت سے ارکان شام اور اردن سے بھی مظاہروں میں شرکت کے لیے آ گئے۔ یہ لوگ پتھروں اور لاٹھیوں سے "مسلح" تھے۔ ان کی تعداد ستر ہزار تھی۔ پولیس نے مظاہرین پر تشدد شروع کر دیا، چنانچہ دو طرفہ تصادم ہوا جس میں بارہ مظاہرین شہید جب کہ اٹھتر کے قریب لوگ زخمی ہوئے۔ دوسری طرف سے ایک آدمی مارا گیا اور زخمیوں کی تعداد پچیس تھی۔ صفد، حیفا، نابلس، ناصرہ اور طولکرم وغیرہ میں بھی پولیس اور برطانوی فوج سے مظاہرین کی جھڑپیں ہوئیں۔ جن میں چھبیس مسلمان شہید اور ایک سوستاسی زخمی ہوئے۔ کمشنر نے ایک بار پھر حکومتِ برطانیہ کو یہودی ہجرت اور قومی وطن کی تعمیر و بنیاد پر اٹھنے والے غم و غصے سے آگاہ کیا اور لکھا کہ فلسطین میں قومی شعور دیگر خطوں سے زیادہ ہے اور برطانوی پالیسیوں نے اسے غم و غصے میں تبدیل کر دیا ہے۔ حکومتِ برطانیہ نے حسبِ عادت ہربرٹ موریسن کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کر دیا تاکہ وہ تحقیق کرے لیکن کمیشن سازی کی حیلہ جو سیاست اپنی مقبولیت کھو چکی تھی اس لیے فلسطینیوں نے اس کا بائیکاٹ کیا۔ حکومت کی طرف سے فسادات کا ذمے دار فلسطینیوں کو قرار دیا گیا اور کئی ایک گرفتار شدہ لوگوں کو جیل کی سزا سنا دی۔ شیخ موسیٰ کاظم الحسینی مظاہروں میں زخمی ہونے والوں میں شامل تھے۔ آپ کی عمر اسی سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ زخموں کی تاب نہ لا کر آپ صاحبِ فراش ہو گئے اور مارچ ۱۹۳۴ء میں انتقال کر گئے۔ موسیٰ کاظم الحسینی کے انتقال کے بعد بہت ساری تنظیمیں اور جماعتیں وجود میں آئیں۔ جہاں موسیٰ کاظم کے دستِ راست جمال الحسینی نے الحزب العربي الفِلسطيني قائم کی وہیں خاندانِ حسینی کے دیرینہ حریف، راغب النشاشیبی نے (جنھیں ۱۹۲۰ء میں موسیٰ کاظم الحسینی کی جگہ بلدیہ القدس کا رئیس بنایا گیا تھا) حزب الدفاع الوطني قائم کی۔ یعقوب العضین نے الشباب العربي الفلسطيني قائم کی، حسین فخری الخالدی نے حزب الإصلاح قائم کی۔ کمشنر واکھوب نے ۱۹۳۴ء میں بلدیاتی کمیٹیوں کے قیام کا اعلان کیا۔ بظاہر یہ فلسطینیوں کے مشہور مطالبے اکثریت و جمہوریت کی بنیاد پر

شراکت اقتدار کے مطابق تھا۔ لیکن جب اس نے بلدیاتی الیکشن کا اعلان کیا تو مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کے درمیان مناقشہ اور منافست میں اضافہ ہوگیا اور یہی وہ چاہتا بھی تھا۔ وہ داخلی خود مختار جمہوری حکومت کے قیام کے حق میں نہ تھا بلکہ مسلمانوں کو مشغول رکھنے کے لیے اس نے یہ طریقہ استعمال کیا۔

اس موقعے پر مفتی امین الحسینی کی کوششوں سے اکتوبر ۱۹۳۴ء میں، مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کے ایک وفاق کا قیام اللجنة العربية العليا کے نام سے عمل میں لایا گیا۔ راغب النشاشیبی بھی اس وفاق میں شامل تھے۔ فلسطینی مسلمانوں کے اتحاد کے لیے یہ ایک اہم کاوش تھی لیکن یہ وفاق زیادہ عرصہ چل نہ سکا۔

جنوری ۱۹۳۵ء میں مفتی امین الحسینی کی کوششوں سے علمائے فلسطین کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ جس میں پانچ سو کی تعداد میں قاضی و مفتی، ائمہ مساجد واعظین اور رجالِ دین شامل ہوئے۔ کانفرنس نے اپنے اعلامیہ میں قرار دیا کہ چپہ بھر زمین بھی کسی یہودی کو فروخت کرنا حرام ہے۔ زمین بیچنے والے اور سودا کرانے والے کو مرتد کی طرح سمجھا جائے گا۔ ان کا مقاطعہ کیا جائے گا اور انھیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا۔ کانفرنس نے حکومت سے مطالبہ کہ وہ بڑی کمپنیوں کے مقابلے میں چھوٹے زمین داروں کا تحفظ کرے۔ کانفرنس نے دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کو فلسطین کے حالات سے آگاہ کرنے اور ان سے مدد حاصل کرنے اور اقتصادی بہتری کے لیے ملکی کمپنیوں کے قیام کا اعلان کیا۔ اہلِ وطن سے اپیل کی گئی کہ وہ ملکی کمپنیوں کے قیام میں مدد کریں۔ یہود کے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے بہت سی تنظیمیں سرگرم تھیں۔ جو باہم جزوی اختلاف کے باوجود اپنے مقصد میں ایک دوسرے سے تعاون کرتی تھیں۔ ان میں مذہبی یہودیوں (حریدیم، اسرائیل میں توریت کے نفاذ کے داعی) کی متشدد تنظیم اَغودات یسرائیل سمیت ہستدروت، ہاشومیر اور موشافیم وغیرہ مصروفِ عمل تھیں۔ سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ یہودیوں کی معاشی ترقی اور عربوں کی معاشی ناکہ بندی اور اس کے لیے مسلمانوں کی زمینیں ہتھیانا ان جماعتوں کا دل پسند مشغلہ تھا۔

یہودی تنظیم ''کیرن ہائی سود''Keren hayesod (یونائیٹڈ اسرائیل اپیل، قائم شدہ ۱۹۲۰ء) اور اسی طرز کی تنظیم ''کیرن کائی میتھ لی اسرائیل'' Keren kayemeth leIsraael، اصل میں یہودی مالیاتی فنڈ تھے۔ (یہ تنظیمیں اب بھی قدرے مختلف ناموں سے قائم ہیں)۔ یہ فنڈ دوسری تنظیموں کو ان کے مذموم مقاصد کی

تکمیل کے لیے فنڈنگ کیا کرتے تھے۔

فلسطین میں کئی سالوں سے یہودی بستیوں اور مزرعات کے قیام کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ مزرعات کیبوتسات kibbutzim کہلاتے تھے۔ یہ عسکری وزرعی فارم تھے۔ یہاں یہودی کسانوں کو مناسب ماحول فراہم کیا جاتا تاکہ وہ زراعت کے ذریعے معاشی ترقی میں حصہ لیں۔ نوجوان یہودیوں کو ان کسانوں کی حفاظت پر مامور کیا جاتا اور انھیں دہشت گردی کی تعلیم و تربیت دی جاتی۔ بلجیک اور دوسرے یورپی ممالک سے ڈرموں میں اسلحہ بھر کر لایا جاتا اور دفاع کے نام پر یہودیوں کو مسلح کیا جاتا اور حکومتی اہلکاروں کے ذریعے یہودی نوجوانوں کو اسلحہ کے استعمال کی تربیت دی جاتی۔ یہود کی فلسطین کی طرف نقل مکانی بھی بڑھتی جارہی تھی چنانچہ ۱۹۳۵ء میں اکسٹھ ہزار سے کچھ زائد یہودی یورپ کے مختلف علاقوں سے فلسطین میں "ظلم وزیادتی" کو فروغ دینے کے لیے داخل ہوئے۔

جاری ہے

کتابیات

القدس و المسجد الأقصى عبر التاريخ، دكتور محمد علي البار

فلسطين في عهد الانتداب، دكتور أحمد طربين

تذكير النفس بحديث القدس، دكتور سيد حسين العفاني

* * * * *

ڈاکٹر مبشر حسین رحمانی، استاذ کمپیوٹر سائنس، ایم ٹی یو، آئرلینڈ

معاشی آزادی، دولت کی غیر مساویانہ تقسیم اور کرپٹو کرنسی

عالمی سطح پر کرپٹو کرنسی کی تحریک چلانے والے معاشی آزادی پر بہت زور دیتے ہیں اور کرپٹو کرنسی پر مبنی معیشت کو معاشی آزادی میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ نیز یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ کرپٹو کرنسی ہمیں آزاد تجارت جو کہ حکومتوں کی اجارہ داری سے آزاد ہو کی بنیاد فراہم کرتی ہے جسے Free Market Fundamentalism Doctrine کے نام سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان میں سب سے اہم دعویٰ جو کیا جاتا رہا ہے وہ یہ کہ کرپٹو کرنسی کے اندر دولت کی مساویانہ تقسیم ہوگی یعنی کرپٹو کرنسی محض چند لوگوں کے پاس مرتکز نہیں ہوگی اور عوام اور ترقی پذیر ممالک سرمایہ دارانہ نظام کے دست نگر نہ ہوں گے۔

آسان الفاظ میں اگر ہم اصلی دنیا کی معیشت Real world economy کی بات کریں تو سن ۲۰۱۸ء کے اعداد و شمار کے مطابق مجموعی طور پر تین سو اٹھاسی افراد کے پاس آدھی دنیا سے زیادہ دولت تھی (حوالہ: Global World Databook 2018)۔ اور اگر ہم اصلی دنیا کی معیشت میں دولت کی تقسیم کے تازہ اعداد و شمار دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ دنیا کے اکثر ممالک میں دولت کی غیر مساویانہ تقسیم ہے اور ان ممالک میں دولت کا بڑا حصہ صرف چند فیصد لوگوں کے پاس ہی مرتکز ہے (حوالہ: Global World Databook 2022)۔ لہٰذا اس معاشی عدم مساوات کو دیکھتے ہوئے یہ دعویٰ کیا گیا کہ اصلی دنیا کی اس دولت کی غیر مساویانہ تقسیم کو ختم کرنے کے لیے کرپٹو کرنسی ایک نیا متبادل عالمی معاشی نظام وجود میں لائی ہے جس کے اندر دولت صرف چند افراد کے پاس مرتکز نہیں ہوگی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دعووں اور نعروں میں معاشی ماہرین کی نظر میں کتنی جان ہے؟ کیا یہ نعرے واقعی حقائق پر مبنی ہیں؟ نیز عالمی معاشی ماہرین ان دعوں کو سائنسی طور پر کیسے پرکھتے ہیں؟ سب سے اہم اور بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا کرپٹو کرنسی اپنی موجودہ حالت میں ایک متبادل معیشت کا نظام دے سکتی ہے جس کے اندر دولت کی مساویانہ

تقسیم ہو؟ جب ہم عالمی معاشی ماہرین اور محققین کی موجودہ سائنسی تحقیقات دیکھتے ہیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ سائنسی تحقیقات اور حقائق ان نعروں اور دعووں سے بالکل مختلف اور برعکس تصویر پیش کرتے ہیں۔

اگر ہم تاریخی طور پر دیکھیں تو معاشیات یا اقتصادیات Economics کا ۱۹۶۹ء، ۱۹۷۱ء، اور ۱۹۸۰ء کا نوبل پرائز جن ماہرین اقتصادیات کو ملا وہ اُن کی مجموعی طور پر ایکونومیٹریکس Econometrics کے شعبے میں خدمات کی وجہ سے دیا گیا۔ انھی تینوں نوبل پرائز یافتہ اقتصادی ماہرین میں Ragnar Frisch وہ ماہرِ اقتصادیات ہیں جنھوں نے ایکونومیٹریکس کی اصطلاح پہلی مرتبہ استعمال کی جو کہ اب باقاعدہ معاشیات کا علیحدہ شعبہ بن چکا ہے۔ ایکونومیٹریکس اکنامک تھیوری Economic Theory ، ریاضیاتی معاشیات Mathematical Economics ، شماریاتی اقتصادیات Statistical Economic اور ریاضیاتی شماریات Mathematical Statistics کے شعبوں کا انضمام ہے یعنی اس کے اندر ریاضیات اور شماریات کو استعمال کرتے ہوئے معاشی قوانین و تھیوریز، اقتصادی تعلقات اور معاشی اعداد و شمار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔

ایکونومیٹریکس کی مدد سے دولت کی غیر مساویانہ تقسیم بھی معلوم کی جا سکتی ہے اور اس کے متعدّد طریقے سائنسی دنیا میں رائج ہیں جن میں سے مشہور Lorenz Curve اور Gini Coefficient ہے۔ Gini Coefficient کی ویلیو صفر اور ایک کے درمیان ہوتی ہے۔ Gini کی ویلیو "ایک" کا مطلب یہ ہے کہ ایک گھرانہ پورے ملک کی معیشت کو کنٹرول کرتا ہے یا ایک ہی گھرانے کے پاس ساری دولت ہے۔ اور "صفر" کا عدد دولت کی کامل مساویانہ تقسیم کو ظاہر کرتا ہے یا آسان الفاظ میں پورے ملک میں دولت ہر ایک پر مساویانہ طور پر تقسیم ہے یا تمام افراد کے پاس برابر مقدار کی دولت ہے۔

مضمون کے آغاز میں ہم نے جن دعووں اور نعروں کا ذکر کیا، ان کی اہمیت اور کرپٹوکرنسی کے وسیع عالمی پروپیگنڈا مہم کی سنگینی کے پیشِ نظر ماہرینِ معاشیات نے ایکونومیٹریکس کی مدد سے کرپٹوکرنسی سے متعلق ان حقائق اور دعووں کی صداقت کو بھی جانچا ہے اور ان سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی تناظر میں ایک موقّر سائنسی جریدے میں چھپنے والی تحقیق کے اندر دنیا کی آٹھ بڑی کرپٹوکرنسیوں یعنی کرپٹو معیشت Crypto Economy کا اصلی دنیا کی معیشت Real World Economy کے ساتھ موازنہ کیا گیا ہے جس کا خلاصہ ہم ذیل میں پیش کرتے

ہیں: ان کرپٹو کرنسیوں میں بٹ کوائن Bitcoin، ڈوج کوائن Dogecoin، لائٹ کوائن Litecoin، زیڈ کیش ZCash، ڈیش Dash، بٹ کوائن کیش Bitcoin Cash، ایتھریم Ethereum اور ایتھریم کلاسک Ethereum Classic شامل ہیں۔ اس تحقیق کے لیے ان محققین نے ان آٹھ کرپٹو کرنسیوں کے جنوری ۲۰۲۱ء تک کہ 1.2 Tera Bytes ڈیٹا کو جس میں تقریباً 1.84 Billion ٹرانزیکشنز تھیں کو استعمال کرتے ہوئے تجزیہ کیا ہے۔ حوالہ: Sai et al., Characterizing Wealth Inequality in Cryptocurrencies, Frontiers in Blockchain, 2021) یہ محققین لکھتے ہیں کہ اگر کرپٹو اثاثوں کی مدد سے ہم نے دولت کی غیر مساویانہ تقسیم کو معلوم کرنا ہے تو سب سے پہلے ہمیں کرپٹو اثاثوں کی ذاتی قدر Intrinsic value اور خارجی قدر Extrinsic value کو دیکھنا ہوگا۔ چونکہ کرپٹو اثاثوں کی ذاتی قدر تو ہوتی نہیں لہذا ہم کرپٹو کرنسی کے تجزیئے کے لیے خارجی قدر پر انحصار کریں گے اور وہ امریکی ڈالر کا ایکسچینج ریٹ ہے۔ پھر معاشی عدم مساوات Economic inequality کو دو طرح سے تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک دولت کی عدم مساویانہ تقسیم Wealth inequality اور دوسری آمدنی کی عدم مساویانہ تقسیم Income inequality۔ چونکہ آمدنی کی تقسیم کرپٹو معیشت سے براہ راست تعلق نہیں رکھتی لہذا ان محققین نے صرف دولت کی غیر مساویانہ تقسیم کا تجزیہ کیا ہے۔

کرپٹو کرنسی کے اندر آزاد تجارت اور پرائیوسی کی بات کی جاتی ہے لہذا کسی انفرادی شخص کی کرپٹو کرنسی کی ملکیت معلوم کرنا آسان نہیں ہوتا۔ دراصل کرپٹو کرنسیاں صارفین کو پرائیوسی مہیا کرنے کے لیے Pseudo anonymity مہیا کرتیں ہیں اور یہ کرپٹو کرنسیاں صارفین کو اتنی سہولت مہیا کرتی ہیں کہ وہ ہر ٹرانزیکشن کو کسی نئے ایڈریس سے کر سکیں۔ جب ایسا ہوتا ہے تو اس طرح سے ایک ہی صارف کی کئی ٹرانزیکشن مختلف ایڈریس سے ہوتی ہیں۔ لہذا یہ مشکل ہوتا ہے کہ ہم ایک ہی صارف کی مع اس کی شناخت کے تمام کرپٹو اثاثوں کی ملکیت معلوم کر سکیں۔ مگر کرپٹو کرنسی چونکہ عوامی کھاتے میں محفوظ ہوتی ہے لہذا ہم آسانی سے کم از کم ایڈریس کی حد تک تو معلوم کر سکتے ہیں کہ کس ایڈریس کے پاس کتنی کرپٹو کرنسی ہے، یہ تمام ایڈریس آپس میں کیسے لنک ہیں اور اس طرح کا تجزیہ کمپیوٹر محققین کرتے رہتے ہیں اور یہی طریقہ کار ان محققین نے بھی اختیار کیا ہے۔

اس سائنسی تحقیق کے اندر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کرپٹو کرنسی کے اندر دولت کی مساویانہ تقسیم اور ڈی

سینٹرلائزیشن کی بات تو بہت کی جاتی ہے مگر کرپٹو کرنسی کے اندر جو دولت کی تقسیم ہے وہ اصلی دنیا کی معیشت کی طرح ہی ہے بلکہ اس سے بھی بری ہے۔ یعنی کہ مجموعی طور پر تقریباً ایک فیصد سے بھی کم ایڈریس کے پاس بٹ کوائن کی اٹھاون فیصد، ڈوج کوائن کی چوالیس فیصد، لائٹ کوائن کی سینتیس فیصد، زیڈکیش کی پینتیس فیصد، ڈیش کی چھے فیصد، بٹ کوائن کیش کی پچیس فیصد، ایتھریم کی چھہتر فیصد، اور ایتھریم کلاسک کی تینتالیس فیصد کرپٹو کرنسیوں کی ملکیت ہے۔ انھوں نے اس بات کو بھی ثابت کیا ہے کہ تین کرپٹو کرنسیوں یعنی ڈوج کوائن Dogecoin ، زیڈکیش ZCash، اور ایتھریم کلاسک Ethereum Classic میں اکیاون فیصد سے زیادہ دولت سو سے کم لوگوں (ایڈریس) کے پاس مرتکز ہے۔ لہذا مجموعی طور کرپٹو کرنسی میں دولت کی تقسیم سائنسی اعداد و شمار کے مطابق اصلی دنیا کی معیشت میں دولت کی تقسیم سے بھی بری ہے۔ ایک اور حالیہ سائنسی تحقیق کے مطابق بٹ کوائن لانچ ہونے سے لے کر بٹ کوائن کی قیمت ایک امریکی ڈالر تک، یعنی تقریباً دو سال کا عرصہ، چونسٹھ لوگ وہ ہیں جنھوں نے زیادہ تر بٹ کوائن کو مائن کیا (حوالہ: A. Blackburn, et al., Cooperation among an anonymous group protected Bitcoin during failures of decentralization, 2022)۔ یعنی شروع کے دو سالوں میں بٹ کوائن کی تمام دولت پر محض ان چونسٹھ لوگوں کا قبضہ تھا۔ یہ بھی بٹ کوائن کے اس دعوے اور سوچ کے برعکس ہے جس کے اندر معاشی آزادی اور دولت کی مساویانہ تقسیم کی بات کی گئی ہے۔

سائنسی دنیا کے اندر آپ کو عالمی معاشی ماہرین اور کمپیوٹر سائنسدانوں کی ان گنت تحقیقات مل جائیں گی جن میں کرپٹو کرنسی سے جڑے دعووں کی حقیقت طشت از بام کی گئی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اگرچہ اس وقت عالمی مارکیٹ میں بٹ کوائن چار سو بلین امریکی ڈالر سے زیادہ کا مارکیٹ کیپیٹل ہے اور بٹ کوائن اور ایتھریم دنیا کی دو بڑی کرپٹو کرنسیوں میں شمار ہوتے ہیں مگر کرپٹو کرنسیاں اپنے دعوے کے برعکس معاشی آزادی اور دولت کی مساویانہ تقسیم صحیح طور پر حاصل نہیں کر سکیں اور کرپٹو کرنسیوں میں دولت کی غیر مساویانہ تقسیم ہے اور دولت محض چند لوگوں کے پاس مرتکز ہے۔ لہذا کرپٹو کرنسی سے متعلق جو دولت کی مساویانہ تقسیم کے دعوے کیے جاتے ہیں وہ سائنسی اور معاشی ماہرین کی نظر میں درست نہیں ہیں۔

* * * * *

دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

یسئلونک

نماز میں عملِ کثیر کا مطلب

سوال یہ ہے کہ نماز میں عملِ کثیر کی تعریف کیا ہے؟ دونوں ہاتھوں سے کپڑوں کو ٹھیک کرنا، ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرنا؟ کتنی دیر تک گنجائش ہے اور ایک رکن میں یہ عمل کتنی دیر کریں تو عملِ کثیر ہوگا اور نماز پر کیا اثر پڑے گا؟ اسی طرح دورانِ نماز بار بار ہاتھ سے مائیک کو درست کرنا کیسا ہے؟ رہنمائی فرمادیں، جزاکم اللہ خیراً

جواب: عملِ کثیر کی تعریف میں فقہا کے مختلف اقوال ہیں، ان میں سے راجح قول یہ ہے کہ ایسا کوئی کام کرنا کہ دیکھنے والا یہ سمجھے کہ وہ کام کرنے والا نماز سے خارج ہے، عملِ کثیر کہلائے گا، ورنہ عملِ قلیل ہے۔ دورانِ نماز کپڑے ٹھیک کرنا، داڑھی پر ہاتھ پھیرنا، مائیک درست کرنا نماز کے احترام اور خشوع وخضوع کے خلاف ہونے کی وجہ سے مکروہ ہے، اس سے اجتناب لازم ہے، اور اگر کوئی شخص دونوں ہاتھوں سے کپڑوں کو اس طرح ٹھیک کرے کہ جس سے دیکھنے والے کو یہ گمان ہو کہ شاید وہ نماز میں نہیں ہے، اسی طرح داڑھی پر اس طرح بار بار ہاتھ پھیرے کہ دیکھنے والا یہ سمجھے کہ نماز میں نہیں، یا دورانِ نماز دونوں ہاتھوں سے اس طرح مائیک درست کرے کہ دور سے دیکھنے والا اسے نماز سے خارج تصور کرے تو عملِ کثیر ہونے کی وجہ سے نماز فاسد ہوجائے گی۔

في الفتاوى الهندية: العمل الكثير يفسد الصلاة والقليل لا. كذا في محيط السرخسي، واختلفوا في الفاصل بينهما على ثلاثة أقوال:(الأول) أن ما يقام باليدين عادة كثير وإن فعله بيد واحدة، كالتعمم ولبس القميص وشد السراويل والرمي عن القوس، وما يقام بيد واحدة قليل وإن فعل بيدين، كنزع القميص وحل السراويل ولبس القلنسوة ونزعها ونزع اللجام. هكذا في التبيين، وكل

ما يقام بيد واحدة فهو يسير ما لم يتكرر. كذا في فتاوى قاضي خان. (والثاني) أن يفوض إلى رأي المبتلى به -وهو المصلي- فإن استكثره كان كثيرا، وإن استقله كان قليلا،وهذا أقرب الأقوال إلى رأي أبي حنيفة – رحمه الله تعالى–. (والثالث) أنه لو نظر إليه ناظر من بعيد إن كان لا يشك أنه في غير الصلاة فهو كثير مفسد، وإن شك فليس بمفسد وهذا هو الأصح. هكذا في التبيين وهو أحسن. كذا في محيط السرخسي وهو اختيار العامة كذا في فتاوى قاضي خان والخلاصة''

[ج:١،ص:١٠٢،١٠١،مكتبه رشيديه كوئته]

و في الفتاوى التاتارخانية: و في الظهيرية:قال بعضهم:كل عمل يقام باليدين عادةً، فهو كثير وإن فعل بيد واحدة، و ما يقام بيد واحدة فهو يسير. م: وقال بعضهم كل عمل يشك الناظر في عامله أنه في الصلاة أو ليس في الصلاة ، فهو يسير، وكل عمل لا يشك الناظر أنه ليس في الصلاة فهو كثير، و في الصغرى: و هو المختار.[ج:٢، صفحة:٢٣٤،مكتبه رشيديه]

و فى الشامية: (و) يفسدها (كل عمل كثير) ليس من أعمالها ولا لإصلاحها، وفيه أقوال خمسة أصحها (ما لا يشك) بسببه (الناظر) من بعيد (في فاعله أنه ليس فيهاوإن شك أنه فيها أم لا فقليل [ج:٢،صفحة:٤٦٥،٤٦٤،مكتبه رشيديه]

۱۴ستمبر ۲۰۲۳ء

فتوی نمبر:۶۴۰۰

والله اعلم بالصواب

*****

احمد جاویدؔ

ادبیات

سرہانے میرؔ کے

مُنعِم کے پاس قاقُم و سَنجاب تھا تو کیا
اُس رند کی بھی رات گزر گئی جو عُور تھا

اس شعر میں کچھ لفظ قدرے مشکل ہیں کیونکہ شعروادب میں بھی ان لفظوں کا استعمال اب نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔ منعم، قاقم، سنجاب، اور عور۔ بلکہ عور کو بھی ذرا مشکل لفظ ہی سمجھنا چاہیے۔ تو پہلے ان الفاظ کو کھول لیتے ہیں پھر شعر کی شرح کریں گے۔ منعم: دولت مند اور مال دار آدمی۔ قاقُم: مخمل جیسا دبیز ریشمی کپڑا جسے کمبل کی طرح اوڑھا جاسکتا ہے۔ سنجاب: کمخواب کی طرح کا ایک چمکیلا اور نقش و نگار والا کپڑا جسے بچھایا جاسکتا ہے۔ عور: مے خوار، آزاد مشرب، فقیر، یہاں مراد ہے بے سروسامان۔ اور عور: جس کے پاس کوئی کپڑا نہ ہو۔ شعر یہ ہے کہ یہ دنیا اور زندگی ایک رات کی ہے جو بھاری سازوسامان کے ساتھ بھی گزر جاتی ہے اور بے سروسامانی کی حالت میں بھی بیت جاتی ہے۔ یہ رات جب تک بیتی نہ تھی تو مفلس، امیر کو رشک سے دیکھتا تھا اور امیر، مفلس کو حقارت سے۔ رات گزر گئی تو پتا چلا کہ امیر بھی احمق تھا اور مفلس بھی نادان تھا۔ امیر کی نظر اپنے قاقم وسنجاب پر تھی اور مفلس کی نگاہ اپنی بے سروسامانی پر۔ دونوں رات کی معرفت اور تجربے سے محروم رہے۔ یعنی دنیا اور زندگی کے حقائق سے بے خبر رہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بظاہر شعر میں مفلس کی بے وقوفی نہیں بتائی گئی لیکن ذرا غور کریں تو عور کا لفظ لا کر میرؔ نے مفلس کی نادانی کی طرف ایک بلیغ اشارہ کر دیا ہے۔ یعنی جس مفلس کو رندی کی حالت نصیب نہ تھی، وہ اس رات میں ڈرتا اور کڑھتا رہا، لیکن جسے یہ حالت حاصل تھی اس نے یہ رات ایک بے خودی کی رو میں گزار دی۔

لیکن اگر عور کے لفظ کو ایک اصطلاح نہ سمجھنا جائے اور اس کے روایتی معانی کو یہاں وارِد نہ کیا جائے تو پھر شعر کا مضمون بالکل سادہ ہے۔ جاڑے کی لمبی رات ہے، یہ رات گزارنے کی زیادہ فکر میں نہ پڑے، یہ تو ویسے ہی گزر جائے گی۔ اگر ہم اس شعر کو اسی مفہوم تک محدود رکھیں تو اس سے بس ایک اخلاقی سبق حاصل ہوتا ہے کہ راستا چاہے ہموار ہو یا ناہموار، کٹ ہی جاتا ہے۔ عقل مند آدمی کو راستے کی ہمواری میں منہمک رہنے یا ناہمواری پر کڑھنے کی بجائے منزل پر نظر رکھنی چاہیے جو بہرحال سب مسافروں کے لیے ایک ہی ہے۔ اگر شعر کا مطلب اتنا ہی ہے تو پھر عُور بھی کوئی صوفیانہ اصطلاح نہیں ہے بلکہ محض ایک عام سا کلمہ ہے جو شراب نوش، فقیر اور مفلس کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اب اس شعر میں داد کے قابل صرف ایک چیز رہ جاتی ہے۔ اور وہ ہے عُور کا استعمال۔ اتنا نادر، غیر معروف اور نامانوس لفظ جس سہولت کے ساتھ برتا گیا ہے وہ حیران کن ہے۔ قاری اس لفظ کو نہ جاننے کے باوجود روانی سے پڑھ جاتا ہے اور یہ احساس بعد میں ہوتا ہے کہ میں یہ لفظ پہلی مرتبہ پڑھ رہا ہوں اور ظاہر ہے کہ اس کا مطلب بھی میرے علم میں نہیں ہے۔ یعنی عور پر ذہن تو اٹکتا ہے مگر زبان نہیں۔ یہ بڑا کمال ہے۔ اس شعر کا جو فوری مفہوم ابھی ہم نے سمجھا ہے، اسی میں رہتے ہوئے اس کے اندر دنیا اور انسان یا تاریخ اور آدمی کے بارے میں ایک بصیرت اور ایک گہرے احساس کو بوجھا جا سکتا ہے۔ دنیا یا تاریخ کے زاویے سے دیکھا جائے تو انسان ایک لگی بندھی حرکت کے نظام میں رہتا ہے۔ وہ یہاں فاعلی پوزیشن اختیار کر لے یا انفعالی حیثیت قبول کیے رکھے، دونوں کا نتیجہ ایک ہی ہے۔ اور جس چیز کو ہم گہرے احساس سے تعبیر کر رہے ہیں وہ تاریخ اور آدمی کے جبری تعلق کو انسانی زاویے سے دیکھنے سے گرفت میں آتا ہے۔ یعنی اس شعر میں مخفی بصیرت تو تاریخ اور دنیا کو حوالہ بنا کر سمجھ میں آتی ہے اور اس میں پوشیدہ احساس انسان کو حوالہ بنا کر دسترس میں آتا ہے۔ وہ احساس اپنی پوری بناوٹ میں ایک جدلیاتی احساس ہے جس میں دو چیزیں بیک وقت لاتعلقی اور تصادم کا احاطہ کیے ہوئے ہیں، دونوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ منعم اور عور میں تصادم کی حالت ہے۔ اور ''تو کیا'' کے ٹکڑے سے اس میں لاتعلقی اور بے نیازی کا عنصر بھی داخل کر دیا گیا ہے۔ گویا ایک گہری المناکی اور ایک لاتعلق بے نیازی جیسے ایک دوسرے کے متوازی چلے جا رہی ہیں۔ یہ اپنی جگہ دو مستقل احساسات بھی ہیں اور ایک نامعلوم اور ناموسوم احساس کا حصہ بھی ہیں۔ وہ نامعلوم احساس جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا، اس شعر میں کارفرما دو متوازی یا

متضاد کیفیات کو ایک محسوساتی بلکہ احوالی وحدت فراہم کر دیتا ہے۔ بلکہ وحدت کی بجائے یہ کہنا چاہیے کہ وہ احساس ان دونوں کیفیتوں کے لیے کل کا درجہ رکھتا ہے جس سے منسوب ہو کر یہ دونوں اپنی تکمیل کے ایک مشترک نقطے تک پہنچ جاتے ہیں۔ اب بات ٹھیک ہوگئی۔ اس شعر میں عور کا کردار مرکزی ہے۔ اس کو ٹھیک سے سمجھنا ضروری ہے۔ تصوف میں عور مستقل احوالِ حضور میں رہنے والے اس مجذوب کو کہتے ہیں جس کے لیے اللہ کے سوا ہر شے غائب بلکہ معدوم ہے، جس کے پاس اللہ کے سوا کچھ نہیں، حتیٰ کہ وہ خود بھی نہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ میرؔ کا متصوفانہ روایت سے کوئی قابلِ ذکر تعلق نہیں ہے لہذا یہاں عور کے صوفیانہ مفاہیم کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ عور کا اصلی مطلب ہے شراب نوش جو ہر وقت میخانے میں ہوتا ہے اور نشے میں رہتا ہے۔ مے خواری اور مے خانہ نشینی کی وجہ سے ظاہر ہے کہ مفلس و نادار بھی ہوتا ہے اور مے خانے کے باہر دنیا میں کیا ہو رہا ہے، اس سے بے خبر اور لاتعلق ہوتا ہے۔ تو اگر عور کو اس کے اصلی مفہوم کے ساتھ دیکھا جائے تو شعر میں یہ کہا گیا ہے کہ منعم رات کی خبر رکھتا تھا لہذا اسے کسی ساز و برگ کر ضرورت ہی نہ تھی۔ یا اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ منعم کی دولت مندی اس وجہ سے ہے کہ وہ دنیا میں رہتا ہے جبکہ عور کی تہی دستی اس سبب سے ہے کہ وہ دنیا میں نہیں رہتا، اسے مال و دولت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ غرض اس طرح کے کئی چھوٹے چھوٹے پہلو نکالے لے جاسکتے ہیں جو اس شعر میں منعم اور عور کے کرداروں کو ذرا باریکی سے سمجھنے میں مدد دے سکتے ہیں۔

میں بھی شعر کا ایک ایسا پہلو اجاگر کرنا چاہتا ہوں جس سے شعر کی معنویت میں ایک آدھ پرت کا اضافہ ہو سکتا ہے اور اس کی پر لطفی بھی بڑھ سکتی ہے۔ اس شعر میں منعم اور عور میں جو تضاد کی نسبت دکھائی گئی ہے، اس میں ایک رمز یہ بھی ہے کہ منعم مال مست ہوتا ہے اور عور حال مست۔ ایک اپنے کمتر سے مغلوب ہے اور دوسرا اپنے سے برتر کا مفتوح، ایک کا ہوش بھی بے خبری ہے اور دوسری کی بے ہوشی بھی ہوشمندی۔ منعم اور عور میں پائے جانے والے تضاد کے ان اسباب کو دیکھنے سے شعر کی معنویت بھی بڑھ جاتی ہے اور کیفیت بھی۔ یہاں تک پہنچ کر میں آخر میں اتنا ہی کہوں گا کہ بہر صورت گزر جانے والی یہ رات منعم کے لیے وجود کی رات ہے جو عدم پر ختم ہوتی ہے اور عور کے لیے یہ عدم کی رات ہے جو وجود پر تمام ہوتی ہے۔

* * * * *

ڈاکٹر رؤف پاریکھ

خاطر خواہ یعنی...؟

چند روز قبل ایک اخبار میں سرخی دیکھی :۔ ’’فلاں سیاست داں کے اثاثوں میں خاطر خواہ کمی‘‘۔ بہت تعجب ہوا کہ یہ کون سا سیاست داں ہے جو اپنے اثاثوں میں کمی چاہتا تھا کیونکہ خاطر خواہ کے معنی ہیں مطلوبہ، خواہش کے مطابق۔ تفصیل پڑھی تو معلوم ہوا کہ ان صاحب کے اثاثوں میں اچھی خاصی کمی ہوگئی ہے لیکن اثاثوں میں کمی کی کسی خواہش کا ذکر نہیں تھا۔ گویا خبر نویس نے خاطر خواہ کی ترکیب کو ’’کافی، بہت یا اچھی خاصی‘‘ کے معنوں میں استعمال کیا تھا۔ اب جبکہ کورونا کے مریضوں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے خطرہ یہ ہے کہ کوئی اخبار یہ خبر نہ چھاپ دے کہ کورونا کے مریضوں کی تعداد میں ’’خاطر خواہ‘‘ اضافہ۔ اور یہ خطرہ کوئی خیالی بات نہیں ہے کیونکہ اب تو چشم بد دور بعض اخبار نویس ’’سِکھا‘‘ کو ’’سیکھا‘‘ اور ’’دِکھا‘‘ کو ’’دیکھا‘‘ لکھنے لگے ہیں۔ گویا جن لوگوں کا املا چوتھی پانچویں جماعت کے بچوں سے بھی گیا گزرا ہے وہ ماشاء اللہ اخبارات میں خبریں لکھنے کے کام پر مامور ہیں۔ کمال افسوس تجھ پر اے کمال افسوس۔

کچھ وضاحت ’’خاطر خواہ‘‘ کی کردی جائے۔ خاطر عربی کا لفظ ہے جس کے متعدّد معنی اسٹین گاس نے اپنی فارسی و عربی بہ انگریزی لغت میں درج کیے ہیں، مثلاً جو بات دل میں آئے، وہ خیال جو ذہن میں گزرے، دھیان، ارادہ، طبیعت، مزاج، ذہن، دل۔ اب لفظ خواہ کو دیکھیے۔ فارسی میں ایک مصدر ہے خواستن، جس کے معنی ہیں چاہنا، آرزو کرنا، خواہش رکھنا۔

گویا خاطر خواہ کے معنی ہیں جس کو دل چاہے، طبیعت کو جس کی خواہش ہو، جو مطلوب ہو۔ لفظ ’’خواہ‘‘ اردو میں لاحقے کے طور پر استعمال ہوتا ہے، مثلاً دل خواہ (جس چیز کو دل چاہے)، خیر خواہ (جو خیر چاہے)، خاطر خواہ (جس کو طبیعت چاہے)، قرض خواہ (جو قرض واپس لینا چاہے)، عذر خواہ (جو عذر چاہے یعنی عذر پیش کرے)، بد

خواہ (جو برا چاہے) وغیرہ۔

گویا یہاں خبر میں "خاطر خواہ کمی" کی بجائے واضح کمی یا نمایاں کمی لکھنا چاہیے تھا۔ ہاں اگر کورونا کے نئے مریضوں کی تعداد اچھی خاصی کم ہوجائے تو یہ خبر یوں دی جاسکتی ہے کہ کورونا کے مریضوں کی تعداد میں خاطر خواہ کمی۔ یعنی اضافہ یا کمی خواہش کے مطابق ہو تو اس کو خاطر خواہ لکھ سکتے ہیں ورنہ نہیں۔ اگر کسی بری چیز مثلاً بیماری یا آفت میں اضافہ ہو تو اسے خاطر خواہ کہنا غلط ہے۔ اگر کسی اچھی چیز مثلاً دولت یا اثاثوں میں کمی ہوجائے تو اسے خاطر خواہ کہنا عجیب ہی سمجھا جائے گا۔ ہاں البتہ اگر کسی کا دل چاہ رہا ہو کہ اس کی دولت اِتنی حد تک کم ہوجائے اور وہ اُتنی ہی کم ہو تب کہا جائے گا کہ ان کی دولت میں خاطر خواہ کمی ہوگئی۔ لاحول ولا قوۃ۔

* * * * *

عالم اسلام کے معروف عالم اور مفکر

الشیخ الدکتور بسام البطوش حفظہ اللہ

کی اہم تصنیف کیف تسللت اللبرالیۃ إلی العالم الاسلامي سے اخذ و استفادہ

عالم اسلام میں

جدیدیت کی تاریخ

پر ایک نظر

مولانا معراج محمد

استاذ فقہ اکیڈمی

فقہ اکیڈمی

شمائل النبی

صلی اللہ علیہ وسلم

صوفی جمیل الرحمٰن عباسی صاحب

مدیر ماہنامہ مفاہیم کراچی | ناظم شعبۂ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

فقہ اکیڈمی

فقہ اکیڈمی کے مکتبے سے حاصل کیجیے

03042278078